واقف ہیں، بڑے زود نویس ہیں، اب ان کی تحریر میں روانی اور دلکشی بھی آگئی ہے، یہ سب تاثراتی مضامین دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں۔

علس جمیل :- از ڈاکٹر اکمل ایوبی صاحب تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۶ قیمت تحریر نہیں، پتہ۔ اپنسوا، صوفیہ کوٹیڑ، مینار کالونی، دودھ پور علی گڑھ۔ یو۔ پی

ڈاکٹر اکمل ایوبی صاحب شعبہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا خاص موضوع ترکی ہے۔ اور اس پر وہ وقتاً فوقتاً مضامین کے علاوہ بعض کتابیں بھی لکھ چکے ہیں، یہ کتاب بھی ترکی اور اس کے ادبیات سے ان کی دلچسپی کا نتیجہ ہے، اس کے ابتدائی چار مضامین میں اردو اور ہندوستان سے ترکی کے تعلق پر بحث کی ہے، اردو خود ترکی لفظ ہے، مصنف نے پہلے قدیم کتبات میں اس لفظ کے استعمال نقل کر کے اس کا مفہوم واضح کیا ہے، پھر اردو زبان پر ترکی زبان کے اثرات مثالوں سے دکھائے ہیں اور ترکی زبان کے مشہور اہل قلم ڈاکٹر عبدالحق تارخان کے پانچ ڈراموں کا تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ ان کا ماحول اور پلاٹ ہندوستان سے ماخوذ ہے، ایک مضمون میں اردو کے مشہور اہل قلم و ادیب سجاد حیدر یلدرم کی ترکی ادبیات سے دلچسپی کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں ان کی تحریروں پر گفتگو کی گئی ہے جو ترکی سے ترجمہ کی گئی ہیں، اس کے بعد کے مضامین میں ترکی زبان کے موجودہ اور قدیم ادب کا جائزہ لے کر دونوں کی خصوصیات ترکی زبان کے نئے رجحانات اور ترکی کے جدید قومی ادب کو فروغ دینے والوں کی کوششوں کا ذکر کیا ہے، آخری مقالہ جدید ترکی میں اسلام میں پہلے اتاترک مصطفےٰ کمال کے سیکولر نظریات سے سیاست و مذہب میں تفریق اور دوسرے بڑے تغیرات کا تذکرہ کیا ہے، پھر بتایا ہے کہ یہ تغیرات و اثرات اب بتدریج ختم ہو رہے ہیں، اس کتاب سے ترکی زبان و ادب کے بارے میں بہت سی مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں، اور یہ ترکی زبان کی مستند کتابوں سے ماخوذ اور مصنف کی ذاتی واقفیت و مشاہدہ پر مبنی ہونے کی وجہ سے مستند سمجھی جا سکتی ہے موضوع کی خشکی بھی مصنف کی تحریر کی خوش سلیقگی سے ختم ہو گئی ہے۔

جلد ۱۳۹، ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۸۷ء عدد ۵

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

مسلمان مطلقہ عورت کے نان نفقہ، مسلم پرسنل لا، مشترکہ سول کوڈ اور بابری مسجد کے مسائل پر ملک کے مسلمان سیاسی طور سے ۱۹۴۷ء کے بعد پہلی دفعہ جاگ اٹھے۔

ان مسائل پر ان کا غیر معمولی طور پر متحرک ہونا اس بات کی علامت ہے کہ وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے ملی تشخص اور وجود کو محفوظ رکھنا پسند کرتے ہیں اس کا بڑا لازمی سرزمین میں اپنی انفرادیت کو گم کر دینا نہیں چاہتے، یوں تو وہ یہاں ہزار برس سے یہاں رہ رہے ہیں، تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ ہندو ان کو اپنے میں ضم نہیں کر سکے اور نہ خود مسلمان انکو اپنے میں مدغم کرنے میں کامیاب ہو سکے، دونوں اپنی اپنی مذہبی، تمدنی، اور انفرادی روایات کے ساتھ زمانہ کے نشیب و فراز کو طے کرتے رہے، مگر آج حقیقی قومیت اور اصلی وطنیت کے بجائے جارحانہ قومیت اور جابرانہ وطنیت کے خود ساختہ تصورات کی بنا پر مسلمانوں پر یہ دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اپنے کو پہلے ہندوستانی اور بعد میں مسلمان سمجھیں، حالانکہ ادھر کچھ عرصہ سے آسام میں آسامیت، بنگال میں بنگالیت، گورکھا لینڈ میں نیپالیت، تامل ناڈو میں تاملیت، تلنگانہ میں تلنگانیت، پنجاب میں پنجابیت، ہر علاقہ کی علیحدہ علیحدہ علاقائیت بھی زور دار طریقہ سے پیدا ہو گئی ہے، ان کی تشکیل میں برہمنیت اور ٹھکرائیت کے جو جذبات و احساسات ابھر رہے ہیں، ان سے ہندوستانیت کے تصورات تو پاش پاش ہو رہے ہیں، مگر لاچار مجبور اور اقتدار سے محروم مسلمانوں کی زبانوں پر اسلامیت کا نام آتے ہی تو قومیت اور وطنیت کی آڑ میں ان کو ہندوستانیت کا اعلیٰ درس دیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کے پیچھے بہت ہی شاندار ماضی رہ چکا ہے، انکے اپنے مذہبی تصورات، سیاسی تخیلات اور اجتماعی رجحانات ہیں، جنکے سہارے وہ اپنی سیاسی زندگی کے بڑے بڑے مراحل طے کر چکے ہیں، ان کی فکر و نظر میں اسلامیت اور ہندوستانیت کا بہت ہی حسین امتزاج ہے، وہ مسلمان بھی ہیں ہندوستانی بھی اور ہندوستانی بھی ہیں مسلمان بھی ہیں، پہلے مسلمان ہونا بعد میں ہندوستانی ہونا، یا پہلے ہندوستانی ہونا اور بعد میں مسلمان ہونا دو متضاد چیزیں نہیں ہیں، ان کے یہاں یہ متضاد چیزیں ہو سکتی ہیں جو قومیت اور وطنیت کے نعرے کو خاص مقصد کیلئے استعمال کرنا چاہتے ہیں مسلمان خالصۃً ہندوستانی بن کر اپنے بلاد وطن سے الگ نہ رہے ہیں اور نہ رہ سکتے ہیں دونوں کی صورت شکل اور وضع قطع میں ایسی یکسانیت ہے کہ بعض اوقات مشکل سے پہچانا جا سکتا ہے کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان، دونوں کی اصلی غذا تقریباً ایک ہی، دونوں کے گھروں میں رہنے سہنے، زینت و آرائش کے سامان میں کوئی زیادہ فرق نہیں، دونوں ایک دوسرے کی معاشرتی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں، دونوں میں ایسے خاندان ملیں گے جن کے افراد ایک دوسرے کو حقیقی رشتہ داروں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں۔

دونوں اپنے مذہبی عقائد و رسوم الگ الگ ضرور رکھتے ہیں، مگر دونوں ایک دوسرے کے مذاہب کا احترام کرنے میں شریفانہ جذبہ بھی رکھتے ہیں، مسلمانوں کے علمی سرمایہ میں ایسا لٹریچر کافی ملیگا کہ انھوں نے ہندوستان کے دوسرے مذاہب کی قدر صرف اس لیے کی ہے کہ یہ ان کے وطن کے ہیں، اس کے علاوہ مسلمانوں کو ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ بنیادی تعلیم ملی ہے۔ کہ اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ لوگوں کو مومن بنا دے تو زمین کے سب لوگ ایمان لاتے تو کیا اے پیغمبر! لوگوں پر زبردستی کرے گا۔ کہ وہ ایمان لے آئیں۔ (یونس۔۱۰۰) مسلمانوں کو قرآن مجید ہی میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اے مسلمانو! جو لوگ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی پرستش کرتے ہیں۔ ان کو برا نہ کہو ورنہ وہ نادانی سے خدا کو برا کہنے لگیں گے۔ (الانعام۔۳۰)

جہاں تک ہندوستان سے محبت کا تعلق ہے، مسلمانوں کا دعوی ہے کہ یہاں آریا قوم چند ہزار برس پہلے آکر گنگا جمنا کے دوآبہ میں پھیل گئی۔ مگر یہاں سے مسلمانوں کا تعلق صرف چند ہزار برس کا نہیں بلکہ ابتداء آفرینش سے یہ ان کا پدری وطن ہے۔ حضرت آدمؑ آسمان کی جنت سے نکالے گئے۔ تو وہ اسی سرزمین کی جنت میں اتارے گئے، جس کو مسلمان "ہندوستان جنت نشان" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور چونکہ نور محمدی حضرت آدمؑ کی پیشانی میں امانت تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اس کو اپنا موروثی پدری وطن سمجھتے ہیں، اور جب مسلمان مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ تو اس سے اپنی محبت کا اظہار اس طرح کرنے لگے کہ،

ع کشور ہند است بہشتی بزمین

ان کا یہ بھی دعویٰ رہا ہے کہ،

سواد ش شدہ زیب روئے زمین   چو خالے بہ رخسارہ نازنین

اور آج بھی وہ یہ نغمہ الاپتے ہیں کہ :-

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور یہ گا کر بھی خوش ہوتے ہیں، کہ

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا

مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے۔

محبت سے ایسے بھرے ہوئے وطنی نغمے سنسکرت یا ہندی میں شاید نہ ہوں گے۔

وطنیت کے اس محبت بھرے تخیل کے ساتھ مسلمان اپنے مذہبی جذبات، ملی احساسات اور طبعی رجحانات بھی رکھتے ہیں، اس بنا پر وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس پر کوئی حملہ آور ہو، یا کوئی ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کر کے قرآن مجید کی طباعت و اشاعت کو اس ملک میں ممنوع قرار دے یا اصحاب جنگ کے ذریعہ سے ان کے پرسنل لا میں ترمیم و تنسیخ کر کے قرآن مجید کے احکام کی خلاف ورزی کرائے، یا ان کو حلال کو حرام اور حرام کو تسلیم کرنے پر مجبور کیا جائے، یا انکی مسجد میں مورتی پوجا ہو، یا انکی تاریخ و تمدن کے روشن چہرے پر تحقیقات کے نام پر ایسی سیاہی پھیر دی جائے کہ لوگوں کو ان سے نفرت پیدا ہو جائے، یا ان کے مذہبی تمدنی اور سیاسی کارناموں کی ایسی مرثیہ ارائی کی جائے کہ ان کا مذہب جو ان کی تمام تحریکات کی روح ہے ہمیشہ کیلئے مردہ ہو جائے۔ یا ان کو کوئی ایسا درس دیا جائے جو وطنیت کا پیرہن ہو مگر وہ ان کے مذہب کا کفن ہو جائے۔ یا انکی زندگی کا سمت اس طرح موڑ دیا جائے جو ان کو راہ الٰہی کے بجائے بولہبی کی طرف گامزن کر دے، اگر انکے ان جذبات و احساسات کا احترام کیا جائے اور انکو مجروح نہ ہونے دیا جائے پھر وہ اپنے پورے وطن کیلئے خون بھی بہاتے رہیں گے، جیسا کہ اپنی گذشتہ تاریخ میں بہاتے رہے ہیں، کیونکہ ان کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تلقین ہے کہ وطن کی محبت جزو ایمان ہے۔

وطن کی دائمی محبت کا جو دم بھرتے ہیں ان کیلئے ضروری ہے کہ جب ہندو مسلمان دونوں کو اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے تو دونوں اپنے میں افہام و تفہیم کا باہمی جذبہ پیدا کریں ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ کر فسادات کے موقع پر خون کی ندیاں بہانے کے بجائے باہمی محبت کے شہد، مؤانست کے دودھ اور یگانگت کے شربت روح افزا کے کوثر و سلسبیل اور گنگا و جمنا بہاتے رہیں۔

مقالات

شرکت و مضاربت اور مستشرق یوڈووتش

از

ڈاکٹر محمد انس زرقا، استاذ ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ، المملکۃ السعودیۃ

مترجم۔ محمد عارف اعظمی عمری،

(۳)

فقہاء کی نگاہ میں نفع کا تصور یوڈووتش کی اس کتاب میں اس کا بھی ذکر ہے، کہ "فقہائے احناف نے اپنے عہد میں رائج تجارتی عرف و عادات سے متاثر ہو کر حصول منفعت ہی کو شرکت و مضاربت کا بنیادی مقصد قرار دیا ہے"۔ (فقرہ ۳۰)

اگر اس کا مفہوم یہ ہے کہ فقہائے احناف نفع کی اہمیت اور معاشرہ میں اس کے مفاد کے پیش نظر اس کو شرکت و مضاربت کا بنیادی مقصد قرار دیتے ہیں، جو شرعاً جائز بھی ہے۔ بشرطیکہ اس کے حصول کے لیے شرعی اوامر و نواہی کی پابندی کی جائے۔ اور اسلامی اخلاق و عادات کا بھی اس میں پورا لحاظ رکھا جائے تو درست ہے، لیکن یوڈووتش کا یہ کہنا غلط ہے کہ فقہاء نے اپنے عہد میں رائج تجارتی عرف و عادات سے متاثر ہو کر اس کو مقصد یا بنیاد بنایا ہے۔ در اصل فقہاء کے اس خیال کی بنیاد وہ روایتیں ہیں، جن میں رزق حلال کے حصول کی تعریف و تحسین کی گئی ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ شرعی قیود و ضوابط اور اسلامی اخلاق و آداب کی پابندی

کرتے ہوئے اگر نفع حاصل کیا جائے تو نفع حلال اور رزق طیب ہوگا۔ چنانچہ اسلامی شریعت میں تجارت کا بنیادی مقصد بھی یہ بتلایا گیا ہے۔ کہ "انسان دست سوال دراز کرنے اور بھیک مانگنے کی لعنت سے محفوظ رہے۔ اور اپنے اہل و عیال کی کفالت کر سکے"[1] ظاہر ہے ایسی صورت میں تجارت کرنے والا شخص اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔

لیکن یوڈووچ کی عبارت کا مفہوم اگر یہ ہے کہ فقہاء تجارتی معاملات میں نفع کا اس حد تک لحاظ رکھتے ہیں کہ اس کے حصول کے لیے شرعی اوامر و نواہی اور اسلامی اخلاق کی خلاف ورزی میں بھی کوئی مضائقہ نہیں خیال کرتے تو یہ رائے اسی مسئلہ میں نہیں، بلکہ فقہی احکام کی تمام تفصیلی جزئیات میں بھی اصولی طور پر غلط ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ فقہاء اگر کسی امر کو بنیادی مقصد قرار دیتے ہیں، تو اس کے حصول کے لیے دینی اور اخلاقی قدروں کو بھی پامال کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں، فقہاء نے تو ایک ایک جزیہ میں دینی اور اخلاقی تعلیمات کو اولین شرط قرار دیا ہے، خواہ ہر جگہ اس کی وضاحت نہ کی گئی ہو۔ شریعت کے اصول و ضوابط، اس کے معاشرتی قواعد، اس کے بنیادی مقاصد اور اس کی اخلاقی تعلیمات ہر ہر مسئلہ میں فقہاء کے پیش نظر رہتی تھیں۔ اور یہ تمام اصولی باتیں ان کے نزدیک "شرائط ملحوظہ" کہلاتی تھیں جن کا درجہ ان شرائط سے کسی بھی طرح کم نہ تھا، جن کا ذکر وہ بعض جزئیات میں کر دیا کرتے تھے، چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک "شرائط ملحوظہ" التزامی حیثیت سے "شرائط ملفوظہ" ہی کا درجہ رکھتی ہیں۔[2]

اسی طرح صدق و امانت اور شریعت کے عام مصالح کا خیال نیز ایک صاحب امر کا وجود جو شرعی حدود اور اسلامی اخلاق کے مطابق معاملات طے کرائے، اور خلاف ورزی کرنے والوں کو تنبیہ کرے۔ یہ ساری باتیں بھی تجارتی معاملات میں بنیادی شرائط کا درجہ

---

[1] موعظة المؤمنين من احياء علوم الدين، جمال الدين القاسمی، ص ۱۸۵، [2] المدخل الفقهی، ف ۲۲۶

رکھتی ہیں، اور فقہاء کے نزدیک ان شرطوں کا لحاظ ہر قسم کے معاملات میں خواہ وہ انفرادی نوعیت کے ہوں یا مشترکہ، ضروری تھا۔ اور انھوں نے کبھی بھی ان حدود کو توڑ کر نفع حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ مثالیں زیادہ تر فقہ حنفی سے ماخوذ ہیں۔ کیونکہ یوڈووچ نے یہ خیال فقہ حنفی ہی کے مطالعہ کے بعد قائم کیا اور اس کی وضاحت بھی انھوں نے متعدد مقامات پر کی ہے۔

اسلامی شریعت کی رو سے ہر قسم کے معاملہ میں امانت و دیانت ضروری ہے، اور امانت کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک طور پر ادا کرے۔ اور معاملات کی تمام شرائط کی پابندی کرے۔ گو عام معاملات میں عدالت بھی کافی موثر ہوتی ہے۔ تاہم بعض صورتوں میں عدالت بھی عاجز اور بے بس ہو جاتی ہے، جیسے کسی معاملہ میں مدعی دلیل پیش نہ کر سکے یا دعویٰ کی سماعت ہی میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے، وغیرہ۔ ان صورتوں میں صرف دینی اور اخلاقی داعیہ ہی فیصلہ کن ہو سکتا ہے۔ کہ ایسی صورت میں کوئی بھی فقیہ اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ عدالتی طور پر گرفت میں نہ آنے کی وجہ سے اخلاقی اور دینی حدود کو توڑ کر نفع حاصل کیا جائے، تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ انسان کو دینی اور اخلاقی قیود و ضوابط کا بھی اسی طرح پابند ہونا چاہیئے، جس طرح وہ شرعی عدالت کے فیصلوں کا پابند ہوتا ہے۔ اس طرح عدالت اور دیانت کے فیصلوں میں فرق ہو جاتا ہے۔[1]

صدق گوئی اسلامی اخلاق کا جزء ہے۔ اور یہ ہر مسلمان پر واجب ہے، دروغ گوئی یا دھوکا اور فریب سے نفع حاصل کرنے کی اجازت اسلامی شریعت میں بالکل نہیں ہے۔ مثلاً خرید و فروخت میں اصولی طور پر قیمت زیادہ طلب کرنا معاملہ کو ختم کیے جانے کا کوئی سبب نہیں ہے۔ معاملات کے بقاء اور استمرار کے علاوہ انسان بالطبع اس حرکت سے گریز کرتا ہے۔ لیکن

---

[1] المدخل الفقهی، ف ۳۰۴

قیمت میں غیر معمولی اضافہ کے ساتھ اگر قولی اور عملی دھوکہ دہی بھی شامل ہو تو مغبون یعنی مشتری کو معاملہ فسخ کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔[1]

اسی طرح بیع کی وہ قسمیں جن میں اصل لاگت کی صراحت کر دی جاتی ہے، ان کی تشریح نقرہ ۲۳ میں گذر چکی ہے۔ ان قسموں میں اگر بائع سامان کی اصل لاگت غلط بتائے تو خواہ وہ مشتری سے زیادہ دام نہ طلب کرے بلکہ بازار میں اس کی جو عام قیمت ہو اسی کو اصل لاگت بتا کر اسی پر سودا کرے، جب بھی مشتری کو دروغ گوئی کی بنا پر معاملہ ختم کر دینے یا پھر صحیح لاگت کے مطابق قیمت ادا کرنے کا حق ہوگا۔ اور اگر بائع دروغ گوئی کا مرتکب نہ ہو بلکہ سامان کی اصل لاگت کو پوشیدہ رکھے اور اس کی وضاحت نہ کرے کہ وہ ثمن مؤجل سے خریدا گیا ہے، یا ثمن عاجل سے، تب بھی مشتری کو معاملہ فسخ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔[2]

اسلامی شریعت کے عام مصالح کا خیال اور ان کی رعایت بھی شرائط محوظہ کا ایک اہم جز ہے، اور فقہاء نے ہمیشہ اسلامی معاشرہ میں اقتصادی فوائد کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے بیع و شراء، شرکت و مضاربت اور زراعت و صنعت کو ان کا اہم وسیلہ بتایا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے بھی یہ تجارتی ذرائع معاشرہ میں بہت اہم اور ضروری ہیں۔ جن کو اسلامی شریعت نے اجتماعی زندگی کی بنیاد کو مستحکم اور مضبوط رکھنے کے لیے فرض کفایہ کے درجہ میں

. . . . . . [1] یوڈوتش کو اس جگہ تسامح ہوا ہے، انھوں نے فقہ کی کتابوں میں بیوع کے ابواب میں لفظ "غبن" کو دھوکہ سمجھ لیا ہے، حالانکہ اس سے مراد قیمتوں کی زیادتی اور اضافہ ہے، چنانچہ جب انھیں یہ نظر آیا کہ فقہاء معمولی غبن یعنی قیمتوں میں معمولی اضافہ کی بنیاد پر کسی معاملہ کو باطل قرار نہیں دیتے ہیں تو انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ فقہاء تجارتی معاملات میں معمولی دھوکہ و فریب کو جائز سمجھتے ہیں، نیز انھوں نے اسکا تعلق اس سے جوڑ دیا، کہ فقہاء کا یہ طرز عمل ان کے اپنے عہد کے تجارتی عرف و عادت سے متاثر ہونے کے نتیجہ میں تھا۔

[2] بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۲۱۳۔

رکھا ہے۔ لیکن کسی معاشرہ میں ان وسائل کو استعمال میں لانے والے افراد اگر محدود ہوں تو ان کی حیثیت فرض عین کی ہو جاتی ہے، اور حسب امر حکمران لوگوں کو انھیں اختیار کرنے کے لیے مجبور بھی کر سکتا ہے۔ البتہ افراد کو یہ حق نہ ہوگا۔ کہ وہ عام نفع سے زیادہ کے طلب گار ہوں۔[1]

دراصل یہ تجارتی وسائل پورے معاشرہ سے وابستہ ہوتے ہیں، مگر ان کا رشتہ چند مخصوص افراد کی منفعت اور رزق کے حصول سے بھی ہوتا ہے۔ لیکن عام مصالح کے تحت ناگزیر حالات میں افراد کے شخصی فائدے نظر انداز بھی کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً بیع میں طرفین یعنی بائع اور مشتری کی باہمی رضامندی ایک اہم بنیاد ہے، یہ رضامندی متعین نفع پر بھی ہو سکتی ہے، اور اس نفع پر بھی جو بائع اور مشتری کے درمیان طے پا جائے لیکن فقہا نے بعض حالتوں میں عام مصالح کے تحت اس اہم بنیاد کو ساقط کر دیا ہے۔ مثلاً

۱۔ فقہائے احناف کے نزدیک بیع میں قیمت کا معمولی اضافہ معاملہ کو فسخ کیے جانے کا سبب نہیں بن سکتا۔ لیکن اضافہ اگر غیر معمولی ہو اور اس کے ساتھ ہی دھوکہ اور فریب سے بھی کام لیا گیا ہو۔ تو معاملہ فسخ کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس عام قاعدہ سے یتیم، وقف اور بیت المال کی ملکیت کی چیزیں مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ ان میں معمولی اضافہ بھی معاملہ کو ختم کر دینے کا باعث ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اگر دھوکہ اور فریب بھی ظاہر نہ ہو، جب بھی معاملہ ختم کر دیا جائے گا۔ کیونکہ شرعی مصالح کی وجہ سے یہ تینوں قسمیں زیادہ حمایت و ہمدردی کی مستحق ہیں۔[2]

۲۔ اگر اسلامی معاشرہ ایسے حالات سے دوچار ہو جائے جن میں لوگوں کے لیے اسباب معیشت مہیا نہ ہوں تو ایسی حالت میں بائع صرف عام قیمت ہی پر اپنا سامان فروخت کر سکتا ہے۔ اور مشتری کی رضامندی کے باوجود بھی اس کے لیے زیادہ نفع لینا جائز نہیں ہے۔[3]

[1] الحسبۃ فی الاسلام۔ ابن تیمیہ ص ۵۵، ۵۹ [2] المدخل الفقہی، ف ۱۹۰ [3] فتاوی ابن تیمیہ ج ۲۹ ص ۳۰۰۔

۳۔ اسی طرح اگر اسلامی معاشرہ میں ذخیرہ اندوزی ناگزیر ہو جائے، تو قاضی ہی اشیاء کی قیمتوں کا تعین کرے گا۔[1]

۴۔ فقہائے احناف نے محض اضطراری حالت میں شرعی مصلحت کی وجہ سے اشیائے خورد و نوش کی قیمتیں متعین کر دینے کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ لیکن بعض مالکی اور شافعی فقہاء نیز علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم نے تو ضرورۃً ہر قسم کے تجارتی مال و اسباب کی عادلانہ قیمت اور اجرت متعین کرنے کا فتویٰ دیا ہے۔[2]

۵۔ مشتری مرسل یعنی ایسا خریدار جو بازار کا عام نرخ نہ جانے اور بائع کی بات مان لے، پس اگر اس سے قیمت زیادہ لی گئی ہو تو یہ بیع فاسد ہو گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "مسترسل سے جو قیمت زیادہ لی جائے گی وہ سود ہے"۔[3]

اسی طرح اسلامی معاشرہ میں ایک صاحب امر کا وجود نہایت ضروری ہے۔ تاکہ وہ معاملات و مسائل کو شرعی احکام اور اسلامی اخلاق کے مطابق انجام دینے کے لیے لوگوں کو آمادہ کر سکے۔ فقہاء کے نزدیک اس کا وجود فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لیے اسلام میں نظام احتساب کو ضروری قرار دیا گیا ہے، اور محتسب کے لیے بعض مستقل فقہی ابواب کی جو تخصیص کی گئی ہے، اس کا تعلق بھی صاحب امر ہی سے ہے۔[4] نیز اکثر فقہاء نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ خرید و فروخت کا معاملہ کرنے والے کو پہلے شریعت کے ان بنیادی احکام و مسائل کی واقفیت حاصل کرنی چاہیے جو اس کو بار بار پیش آئیں گے تاکہ وہ لاعلمی کی وجہ سے کسی غلطی کا ارتکاب نہ کر سکے۔[5] غرض فقہاء

---

[1] بدائع الصنائع ج ۵ ص ۱۲۹۔ [2] الملکیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ، عبدالسلام العبادی جلد ۲۔ ص ۳۰۳ [3] کنز العمال۔ ج ۴ ص ۵، [4] الحسبۃ فی الاسلام۔ ابن تیمیہ۔
[5] مسائل السماسرۃ للالبانی۔ مقالہ از ڈاکٹر ابو الاجفان۔ ص ۵۱۲

حصول نفع کو اسی وقت مناسب اور جائز قرار دیتے ہیں۔ جب وہ شرعی احکام اور صدق امانت وغیرہ اسلامی اخلاق کے دائرہ میں ہو۔ اور اس کی وجہ سے شریعت کے بنیادی مقاصد مجروح نہ ہوتے ہوں۔

ان امور و مقاصد کی حفاظت اور معاملہ کرنے والوں کی نگرانی ایک صاحب امر کے ذمہ ہوگی۔ فقہاء نے معاملات کی بعض صورتوں کو صرف اس بناء پر مکروہ قرار دیا ہے کہ انھیں اختیار کرنے کے نتیجہ میں غیر مشروع افعال کا اندیشہ اور احتمال رہتا ہے، مثلاً ایک مسلمان کے کسی غیر مسلم سے مضاربت کا معاملہ کرنے کی صورت میں وہ غیر مسلم کو عامل بنانے کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ وہ سود بھی لے سکتا ہے۔ اور لاعلمی میں اس سے شریعت کے احکام کی خلاف ورزی بھی ہو سکتی ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک ان مسلمانوں کو بھی مضاربت میں عامل بنانا مکروہ ہے۔ جو خرید و فروخت کے معاملہ میں زیادہ محتاط اور شریعت کے احکام کے پابند نہیں ہوتے۔[1] یہ تمام باتیں خود یوڈووتش نے بھی اپنی کتاب میں نقل کی ہے۔[2]

یوڈووتش کا یہ قول درست ہے۔ کہ "مضاربت میں عامل کے تصرف کے صحیح اور درست ہونے کے لیے ایک بنیادی معیار حصول نفع بھی ہے۔" (فقرہ ۲۵) فقہاء کا حصول نفع کو معیار بنانا مصلحت پر مبنی ہے، جس کا مقصد دوسرے شریک یعنی صاحب سرمایہ کے مال کا تحفظ ہے۔ اس لیے اگر عامل کو نفس سرمایہ سے صدقہ و خیرات کرنے یا عام قیمت سے کم پر سامان فروخت کرنے کا اختیار دیدیا جائے تو اس سے صاحب سرمایہ کا نقصان ہو گا۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ مشترکہ نوعیت کے تمام معاملات میں اسلامی شریعت کا یہی عام اور بنیادی اصول ہے چنانچہ جب کوئی شخص کسی کے مال کا ولی ہو تو اسے صرف ایسے ہی مواقع پر مال خرچ کرنا چاہیے، جہاں

---

[1] المبسوط۔ ج ۲۲۔ ص ۱۲۵ [2] ص ۲۲۸ و ۲۲۹

صاحب مال کے فائدہ کا امکان ہو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی یتیم کا ولی یا موقوفہ جائیداد کا متولی بنایا جائے تو اس کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس مال میں سے صدقہ و خیرات کرے یا اس کو عام نفع سے کم پر فروخت کرے۔ اس سلسلہ میں نفع کا اس درجہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ قاضی کو بھی اس قسم کے مال میں کسی طرح کا حکم صادر کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

فقہ میں عرف کا درجہ

اسلامی فقہ میں عرف و رواج کی حیثیت اور اس کے مقام و مرتبہ کی وضاحت میں بھی یوڈوتش کو دھوکہ ہوا ہے، اوپر ان کی یہ رائے نقل کی جا چکی ہے۔ کہ "فقہ حنفی میں استحسان کی راہ سے عرف و دستور کا نفوذ ہوا۔" (فقرہ ۲۹) یوڈوتش کے نزدیک فقہائے احناف کا یہ رویہ مستحسن ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "فقہی اصول و نظریات کی رو سے عرف و رواج فقہ کی کوئی بنیادی اصل نہیں ہے۔" (فقرہ ۳۰)

اسلامی شریعت میں عرف کا کیا درجہ ہے۔ اور فقہاء نے کن حالتوں میں اس کا لحاظ کیے جانے کو پسندیدہ قرار دیا ہے۔ اور کن صورتوں میں اس کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔ ان تمام باتوں کی وضاحت کے لیے عرف کے متعلق چند بنیادی اصول بیان کیے جاتے ہیں۔[1]

۱۔ تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام میں عرف کو بذات خود شرعی امر یا نہی کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ البتہ اگر قرآن مجید اور سنت نبوی سے اس کی تائید ہوتی ہو تو اس کا لحاظ کیا جائے گا۔ لیکن یہ خود امر و نہی کی اصل نہیں قرار پائے گا۔ بلکہ قرآن و سنت کے تابع ہوگا۔ اس لیے حقیقی اصل و بنیاد وہی ہوں گے۔ چنانچہ نبی کریمؐ کے عہد مبارک میں جو چیزیں عرفاً رائج تھیں۔ ان میں سے جن کو قرآن و سنت نے برقرار رکھا ہے۔ یہ ان کے مباح اور جائز ہونے کی ایک شرعی دلیل ہے۔ مضاربت کا بھی معاملہ اسی نوعیت کا ہے۔ "یہ طریقہ زمانۂ جاہلیت

[1] یہ اصول باختصار کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ المدخل الفقہی کے باب نظریۂ عرف (ص ۸۳۰-۹۳۲) سے ماخوذ ہیں۔

میں بھی موجود تھا۔ اور اسلام نے بھی اس کو برقرار رکھا۔[1] البتہ قرآن و سنت کی واضح ہدایت کی روشنی میں احکام کی تطبیق و تفصیل عرف سے کی جائے گی۔ جیسے شریعت کی رو سے بیوی کا نفقہ اس کے شوہر پر واجب ہے یا کوئی محتاج اور ضرورت مند ولی اگر یتیم کے مال سے کچھ لے تو اس کے لیے مباح ہے۔ اسی طرح اسلامی شریعت میں دست سوال دراز کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ لیکن اگر کوئی فقر و فاقہ سے دوچار ہو جائے تو اس کے لیے اس کی اجازت ہے۔ یہ تمام بنیادی فیصلے (وجوب، اباحت یا ممانعت) اسلامی شریعت کے بنیادی مصادر قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں۔ لیکن ان کی تطبیقی صورتیں عرف سے متعین ہوں گی۔ مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک خاتون حاضر ہوئیں اور انھوں نے یہ شکایت کی کہ ان کے شوہر بخیل ہیں اپنے اہل و عیال کی کفالت نہیں کرتے۔ آپؐ نے ان کو یہ اجازت مرحمت فرمائی کہ وہ اپنے اور اپنے بچوں کی کفالت کے لیے اپنے شوہر کے علم میں لائے بغیر ان کا مال مناسب مقدار میں لے سکتی ہیں۔[2]

اسی طرح یتیم کے ولی کے بارہ میں قرآن مجید کا یہ عام حکم ہے۔

مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ — جو شخص مستغنی ہو سو وہ تو اپنے کو بالکل بچائے

وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ — اور جو شخص حاجت مند ہو تو وہ دستور کے

بِالْمَعْرُوفِ (نساء - ۶) — مطابق کھائے۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر و فاقہ کی وجہ سے دست سوال دراز کیے جانے کی تعیین یوں کی ہے۔

حَتّٰى يَقُولَ ثَلَاثَةٌ مِنْ ذَوِي — (آدمی کو سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے)

الْحِجَا مِنْ قَوْمِهِ: قَدْ أَصَابَتْ — تا آنکہ اسی کی قوم کے تین ذی عقل

[1] ہدایۃ المجتہد، ج ۲، ص ۲۳۳ و اللباب فی شرح الکتاب، المیدانی، ج ۲، ص ۱۳۱ [2] صحیح مسلم ج ۵ ص ۱۲۹

فلانا فاقۃ[۱] افرادیہ نہ کہدیں کہ فلاں فاقہ زدہ ہے۔

۲۔ شریعت کی نگاہ میں عرف کا زیادہ تر اعتبار مختلف نوعیت کے معاملات اور ان کے حق تصرف میں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طور پر فریقین کے تفصیلی معاملات کی تعیین اور ان کے حقوق و اختیارات کی حد بندی کی جاتی ہے۔ اصولی حیثیت سے یہ حد بندیاں شریعت میں ممنوع نہیں ہیں۔[۲] چنانچہ فقہاء کے اکثر اختلافات مسلمہ اصولوں کے تحت تفصیلی جزئیات ہی میں ہوتے ہیں۔ مثلاً مضارب مضاربت کا سامان ادھار فروخت کر سکتا ہے یا نہیں؟ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فروخت کر سکتا ہے۔ لیکن امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک نہیں کر سکتا۔ اس اختلاف کی توضیح کرتے ہوئے علامہ ابن رشد رقمطراز ہیں۔

"یہ اختلاف ظاہری نوعیت کا ہے، کیونکہ تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں۔ کہ مضارب کو مضاربت کے سامان میں اسی قدر تصرف کا حق حاصل ہے جو عرف اور دستور کے مطابق ہو۔ اور جس کے کرنے کے عموماً لوگ عادی ہوں۔ چنانچہ جو فقہاء سامان کو ادھار فروخت کرنے کو عام تصرف سے خارج قرار دیتے ہیں وہ مضاربت کے معاملہ میں بھی اس کو خارج از تصرف قرار دیتے ہیں۔ اور اس کو جائز نہیں سمجھتے ہیں۔[۲]

مضارب کے اختیارات کے باب میں فقہاء کا اختلاف اسی نوعیت کا ہے، جسکی تفصیل اس تلخیص کے فقرہ ۲/ میں بحث کی جا چکی ہے۔

۳۔ بسا اوقات عرف کے سبب شریعت کے کسی عام حکم کی علت کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور اس حکم کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ جیسے فقہائے احناف کے نزدیک معاملہ بیع کے ساتھ کوئی شرط نہیں رکھی جا سکتی۔ کیونکہ حدیث نبویؐ میں اس کی ممانعت وارد ہوئی۔

۱؎ صحیح مسلم۔ ج ۵ ص ۹۰، ۹۱ ۲؎ بدایۃ المجتہد۔ ج ۲ ص ۲۳۵

لیکن اگر اس طرح کی شرط ہو جو لوگوں میں عام طور پر رائج ہو تو وہ اس کی اجازت دیتے ہیں۔ اور اس کی بنیاد ان کے نزدیک یہ ہے کہ حدیث شریف میں وارد ممانعت کی علت نزاع کا سد باب ہے۔ اور کسی متعین اور معروف شرط میں نزاع کا خدشہ ہی نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے اس صورت میں ممانعت کی علت نہیں پائی جاتی ہے۔[۱]

۴۔ بعض عرف عام ضرورت یا کسی جائز مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں۔ پس اگر یہ کسی شرعی حکم سے متصادم نہ ہوں، اور ان سے عام روایتوں اور اجماع کی مخالفت بھی نہ ہوتی ہو تو فقہائے احناف اور مالکیہ کے نزدیک یہ قیاس سے بھی زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس لیے تعارض کے وقت وہ اس کو قیاس پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور یہ ترجیح استحسان کے قبیل سے ہوتی ہے۔[۲] ان کے خیال میں اس نوعیت کے عرف کا اعتبار نہ کرنا لوگوں کو حرج اور مشقت میں مبتلا کرنا ہے۔ جس سے قرآن مجید میں روکا گیا ہے۔

فقہائے حنفیہ اور مالکیہ کی یہ رائے ہمارے نزدیک قابل قبول ہو یا نہ ہو تاہم اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے شریعت کے عام مصالح اور اس کے ان نصوص کی پابندی کو ملحوظ رکھا ہے، جن کو فقہاء نے اپنے استدلال میں اصولی حیثیت دی ہے۔ ان کے متعلق یہ خیال کرنا بالکل غلط ہوگا کہ انھوں نے محض مروجہ عرف و دستور کی رعایت میں اپنی رائے قائم کی ہو۔ اور وہ بھی ایسے موقع پر جب ان کے لیے ان کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔

۱؎ المدخل الفقہی۔ ص ۲۲ (ف ۵۲۲، ۵۲۷) ۲؎ ایضاً (ف ۵۳۱)، اقتصادی نقطۂ نظر کر اس کی ایک مثال یہ ہے۔ کہ مشہور حنفی فقیہ محمد بن مسلمہ نے دلال کی اجرت کو جائز قرار دیا ہے۔ حالانکہ قیاس کی رو سے احناف کے نزدیک یہ فاسد ہے۔ مگر چونکہ عام معاملات اسی طور پر انجام پاتے ہیں۔ اور لوگوں کو اس کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ اس لئے اس کی اجازت دی گئی ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ عرف و دستور یا عام ضرورت کے تحت اگر قیاساً ممنوع فعل کو جائز بھی قرار دیا جاتا ہے۔ تو اس کا درجہ مباح ہی کا ہوتا ہے۔ جو شریعت کی نگاہ میں مطلوب اور پسندیدہ نہیں ہے۔

ہمارے خیال میں اسلامی شریعت نے عرف کا جو درجہ و مرتبہ متعین کیا ہے۔ اس کا صحیح تصور یوڈووتش کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا ہے۔ درحقیقت فقہاء نے عرف کی بنیاد پر بھی جو باتیں کہی ہیں۔ وہ قرآن و سنت ہی کے موقف کی تعبیر و تشریح پر مبنی ہیں۔ اس امر کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ان کو فقہاء کے طرز عمل میں تناقض نظر آتا ہے۔

اس کتاب کا منہج و اسلوب یوڈووتش کی زیر بحث کتاب میں بہت ہی مرتب اور واضح انداز میں بحث و گفتگو کی گئی ہے۔ فقہاء کے اقوال اصل ماخذ سے نقل کر کے دلیل و بنیاد کی حیثیت سے پیش کیے گئے ہیں، اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ ان اقوال کو باہم مربوط قرار دے کر ان کو سمجھنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اور پھر ان کی روشنی میں معنی خیز نتائج نکالے گئے ہیں، گو بعض نتائج سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس قدر مسلم ہے کہ یہ نتائج خود ساختہ نہیں۔ اور نہ پہلے گھڑے کردہ ہیں۔ جن پر خواہ مخواہ کے لیے دلیلیں مہیا کر دی گئی ہوں بلکہ بڑی محنت اور دقت نظر کے بعد ان نتائج تک پہونچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف کا یہ انداز بھی عمدہ اور پسندیدہ ہے۔ کہ وہ عموماً حق و انصاف کی شاہراہ پر گامزن رہ کر معتدل و متوازن نتائج سامنے لاتے ہیں۔

مصنف اپنے پیش رو بعض مستشرقین کی رائیں نقل کر کے ان پر مناسب تبصرے بھی کرتے ہیں۔ (فقرہ ۱۰-۲۳) گو اس کتاب کی پہلی فصل میں اسلامی شریعت سے متعلق مستشرقین کی بعض غیر منصفانہ و غلط رائیں نقل کی گئی ہیں۔ مگر ان پر کوئی خاص تبصرہ کرنے کے بجائے صرف اسی قدر

لکھنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ کہ یہ باتیں اعادۂ و نظر ثانی کی محتاج ہیں۔ لیکن کتاب کی آخری فصل میں نتائج کے بیان میں انھوں نے مستشرقین کی ان رایوں کی پرزور تردید کی ہے۔ اس سے ان کے فکر کی صحت و پختگی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے پیش رو مستشرقین سے مرعوب نہیں ہیں۔ بلکہ جب موقع آتا ہے ان کی تردید و مخالفت سے گریز نہیں کرتے۔

ان خوبیوں کے باوجود اس کتاب میں اسلوب اور طرز تحریر کی جو خامیاں پائی جاتی ہیں، ان کی جانب توجہ دلانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

فقہ کے بنیادی مصادر سے پہلو تہی یوڈووتش کے اسلوب کی سب سے بڑی اور زبردست خامی یہ ہے کہ انھوں نے اسلامی شریعت کے الٰہی ماخذ یعنی قرآن و سنت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ جس کی بنا پر فقہی احکام و مسائل کی توضیح و تعلیل میں ان سے جا بجا لغزشیں سرزد ہو گئی ہیں۔ چونکہ انھوں نے ان بنیادی مصادر کو نظر انداز کر دیا ہے، اس لیے ان کو مجبوراً اسلامی شریعت کے جغرافیائی ماحول اور تاریخی پس منظر کو زیادہ اہمیت دینی پڑی ہے۔ حالانکہ اس بات کو ہر مسلمان بخوبی واقف ہے کہ اسلامی فقہ کے تمام بنیادی احکام و مقاصد قرآن مجید اور سنت نبویؐ میں مذکور ہیں۔ البتہ فقہ کے فروعی مسائل قرآن و سنت کی روشنی میں فقہاء کے اجتہاد و استنباط پر مبنی ہیں۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ استنباط و استنتاج ایک انسانی عمل ہے، جس میں وقت، ماحول اور دوسرے اثرات کا بھی دخل ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس شریعت کے الٰہی مصادر (قرآن و سنت) میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر تمام فقہائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ فقیہ کا اجتہاد و استنباط صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی، یعنی اس میں وقت، ماحول، ناقص و محدود ادراک اور شخصی میلان کا بھی اثر ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی بھی مسئلہ میں کسی فقیہ کے فہم و ادراک اور اس کے استنباط کو تعلیم خداوندی کی حقیقی تعبیر نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

علماء کو آغاز اسلام ہی سے اس کا احساس تھا۔ چنانچہ انھوں نے عملی احکام میں ہدایت خداوندی کی حقیقت تک رسائی کے لیے مختلف وسائل اور طریقے اختیار کیے۔ تاکہ وہ شخصی یا تاریخی عوامل کی کار فرمائی سے خالی رہیں۔ اسی کوشش کے نتیجہ پر فقہ، اصول فقہ اور اصول حدیث وغیرہ متعدد شرعی علوم وجود میں آئے۔

اسلامی عقائد اور قرآن وسنت کی تعلیمات میں بھی اصحاب علم اور فقہاء کو بار بار اخلاص اور دیانت داری کی تلقین کی گئی ہے۔ اور شخصی عوامل اور طبعی میلان سے دور رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اور اس بات پر سخت عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ کہ کوئی عالم جان بوجھ کر اجتہاد واستنباط میں اپنے داخلی میلان سے کام لے کر اس کو شریعت کی جانب منسوب کرے۔

ہمارے خیال میں اس سلسلہ میں صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ گو فقہاء کے اجتہادات تمام تر شخصی اور تاریخی عوامل سے خالی نہیں ہوتے تاہم ان کی کوئی خاص حیثیت واہمیت اس لئے نہیں ہوتی کہ خود فقہاء کے اختلافات سے ان کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ مگر وہ عامل جس کا اثر تمام ہی فقہاء پر سب سے گہرا اور دور رس ہے۔ وہ قرآن وسنت کی شکل میں الٰہی ہدایت ہے۔ اس طور پر فقہ کے الٰہی مصادر کو نظر انداز کرنا فقہ کے سب سے اہم اور موثر عامل کو نظر انداز کرنا ہے۔

یوڈوتش نے اس کتاب میں اسلامی فقہ کا جس انداز میں ذکر کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک خالص انسانی عمل ہے، گو اس نوعیت کی کوئی صریح عبارت ان کی کتاب میں نہیں ہے، تاہم ان کے انداز بحث وگفتگو اور احکام ومسائل کی تفسیر وتوضیح کے طرز سے یہی بات مترشح ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن مسائل میں فقہائے قرآن وسنت سے دلیلیں پیش کی ہیں ان کو وہ بہت کم نقل کرتے ہیں، اسی طرح فقہاء کے اختلاف کا سبب وہ شرعی نصوص وروایات میں ان کے فہم وتفسیر کے اختلاف کو نہیں بتلاتے۔ بلکہ عام طور پر وہ انکے اختلافات کو ان کے

اقتصادی ماحول اور ان کے علاقے کی تجارتی سرگرمیوں میں فرق واختلاف کا نتیجہ بتلاتے ہیں۔ اسی طرح وہ حنفی مسلک میں شرکت ومضاربت کے اصول کو تاجروں کے خود ساختہ تجارتی قانون سے تعبیر کرتے ہیں۔ (فقرہ ۲۰) اس طرح دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے کو مصنف یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ فقہائے اسلام اپنے اختلافات اور اجتہادات یا مختلف نوعیت کے معاملات کی حرمت وحلت کے سلسلہ میں اس ہدایت کے پابند نہیں ہیں جو قرآن مجید اور سنت مطہرہ میں بتائی گئی ہے[۱]

فقہ حنفی میں استحسان کی حقیقت یوڈوتش کی اس کتاب میں متعدد مقامات پر اس کا بھی ذکر آیا ہے کہ فقہائے احناف ظاہر قیاس کو چھوڑ کر عملی ضرورت کی رعایت کے لیے استحسان کو بنیاد بناتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ شریعت کے عام بنیادی احکام عموماً فقہا کے عہد وماحول کے تجارتی عرف ودستور یا ان کے دور کے لوگوں کی تجارتی سرگرمیوں کے متصادم تھے۔ جس سے بچنے کے لیے انھوں نے استحسان کا اصول وضع کیا۔ یوڈوتش کے اس خیال پر تبصرہ کرنے سے پہلے لفظ استحسان کے معنی ومفہوم اور اسکی اصل وبنیاد پر مختصر گفتگو کر لینا مناسب ہوگا۔ کی یہ قسم جس کا یوڈوتش نے بار بار ذکر کیا ہے، فقہائے احناف کے نزدیک استحسان ضرورت کہلاتی ہے[۲]۔ اور وہ یہ ہے کہ ناگزیر حالات میں مصلحت وضرورت کے پیش نظر کسی ایسے حکم پر عمل نہ کیا جائے، جو از روئے قیاس صحیح اور درست ہو۔ تاکہ ضرورت بھی پوری ہو جائے۔ اور مشقت بھی نہ اٹھانی پڑے۔ استحسان کی یہ قسم ایسے احکام اور مسائل پر مشتمل ہوتی ہے جو مبنی بر مصلحت ہونے کے ساتھ فقہی اصول

---

[۱] اس کی وضاحت کے لیے تلخیص کا فقرہ ۳ ملاحظہ فرمائیں۔ [۲] حنفیہ کے نزدیک استحسان کی ایک قسم اور بھی ہے۔ اور وہ ہے استحسان قیاسی، یعنی کسی مسئلہ میں کئی قیاس جمع ہو جائیں، اور ان میں کسی ایک قیاس کو ترجیح دی جائے (المدخل الفقہی ف ۱۵)، فقہائے مالکیہ کے نزدیک یہ صورت بھی استحسان کی نہیں بلکہ قیاس ہی کی ایک قسم ہے۔

وضوابط اور شریعت کے عام مصالح سے بھی ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اور اس سے اس لیے کام لینا پڑتا ہے کہ بعض اوقات قیاس پر عمل کرنے میں بڑی دشواریاں ہوتی ہیں۔ غرض استحسان کی یہ قسم صحیح معنوں میں مصالح مرسلہ ہی کی ایک قسم ہے۔[4]

مالکیہ نے استحسان کو "غلو قیاس" کا جواب اور حل کہا ہے۔ کیونکہ غلو قیاس میں شدت غلو سے جب مشقتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے تو ان سے بچنے کے لیے فقہاء کسی مناسب استثنائی شکل کو اختیار کرتے ہیں۔ اس مسلک میں استحسان کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"مندرجہ ذیل تین باتوں میں کسی بھی ایک وجہ سے ظاہر قیاس پر عمل کرنا ممکن نہ ہو۔ اس کو ترک کرنے کا نام استحسان ہے۔ (۱) کوئی مشہور عرف ظاہر قیاس سے متصادم ہو (۲) کوئی اہم مصلحت درپیش ہو۔ (۳) حرج اور مشقت کا اندیشہ لاحق ہو۔"

حنفی مسلک میں استحسان ضرورت کی نوعیت جو بھی ہے۔ حنبلی مسلک میں بھی مصالح مرسلہ کا اسی طرح اعتبار کیا گیا ہے۔ جس طرح مالکی مسلک میں کیا گیا ہے۔ اور استحسان دراصل مصالح مرسلہ ہی کا ایک جزو اور حصہ ہے۔ چنانچہ اس مسلک میں بھی احکام و مسائل کے اثبات کے لیے استحسان ہی کا سہارا لیا جاتا ہے۔[5]

غرض وہ استحسان جو شریعت کے بنیادی مقاصد کا پابند ہو۔ اور جس میں شریعت کے عام مصالح کا لحاظ بھی رکھا گیا ہو، اس کے بارہ میں اگر فقہائے احناف اور مالکیہ کا یہ کہنا ہے کہ تعارض کے وقت اس کو قیاس پر ترجیح حاصل ہوگی تو ان کا یہ قول بجا اور حیرت انگیز نہیں ہے۔ کیونکہ قیاس کا سارا دارومدار محض عقل پر ہوتا ہے۔ فقہائے مالکیہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ تعارض کے وقت عام اور ظنی روایتوں کی تخصیص بھی مصالح مرسلہ سے کی جائے گی گویا مالکیہ کے نزدیک عام اور ظنی روایتوں کی تخصیص

---

[4] ملہ غل، ص ۱۱۰ [5] ایضاً، ص ۳۰۔

مصالح مرسلہ سے کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں فقہائے احناف کا موقف بھی بعینہ یہی ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ استحسان اور مصالح مرسلہ کو حنفی، مالکی اور حنبلی تینوں ہی مسلکوں میں بنیاد بنایا گیا ہے۔ اور اسلامی شریعت و قانون کی تبیین و توضیح کے اہم ذرائع میں شمار کیا گیا ہے۔ اس بنا پر یوڈووتش کا یہ خیال صحیح نہیں کہ یہ محض حنفی مسلک کی خصوصیت ہے یا فقہاء نے صرف عام مصلحتوں اور ناگزیر حالتوں میں اس کو قیاسی احکام پر فوقیت اور ترجیح دی ہے۔ کیونکہ اس سے عرف و رواج اور اسلامی شریعت کے درمیان تصادم کا احتمال اور یہ خیال ہوتا ہے کہ تصادم کے وقت شریعت کو عام مصالح یا درپیش حالات کے مطابق بنایا جاسکتا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ فقہاء کی نگاہ میں قیاس ظاہر بالعموم ایک ہی علت پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اس علت پر مبنی بعض ایسی صورتیں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ جو شریعت کے بعض ایسے اہم مقاصد سے متصادم ہوتی ہیں۔ جن کا لحاظ زیادہ اہم اور ضروری ہوتا ہے۔ پس ان ہی حالتوں میں استحسان، استصلاح اور مصالح مرسلہ پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ جس کی صراحت آیات میں کی گئی ہے۔ جن میں مصلحت و ضرورت کے اقتضا اور مشقت و تکلیف کو دفع کرنے کا حکم دیا گیا ہو۔ جیسے اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے۔

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ ۲ - ۱۸۵)	اللہ تعالٰی کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں۔
وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ - (حج ۷۸)	اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی۔

نیز سنت نبوی ﷺ سے بھی اس عام اصول کی تائید ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل

استحسان اور مصالح مرسلہ وغیرہ اسلامی شریعت کی نمایاں خصوصیات ہیں جن کو محض کسی خاص فقہی اسکول اور مکتبِ فکر کی ایجاد سمجھنا غلط ہے۔

تقابلی مطالعہ میں حنبلی مسلک کا عدم ذکر یوڈووتش نے اس کتاب کی پہلی ہی فصل میں اسکی صراحت کر دی ہے کہ تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں حنبلی مسلک کو اس کتاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں انھوں نے باقی تینوں فقہی مذاہب کو خاطر خواہ اہمیت دی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ابتدائی دور میں یعنی دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے اوائل میں نہ حنبلی مسلک کی زیادہ اشاعت ہوئی تھی اور نہ اس زمانہ میں اس کے مآخذ و مراجع ہی موجود تھے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اسی متعین زمانہ کے مراجع ہی کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یوڈووتش کا نہ یہ دعویٰ ہی صحیح ہے اور نہ ان کا عذر ہی معقول ہے۔ کیونکہ خود امام احمد بن حنبلؒ کی زندگی اسی عہد میں گزری ہے (۱۶۴ھ - ۲۴۱ھ) اس لئے امام صاحب کے اقوال و آراء کو تو مآخذ بنایا جا سکتا تھا۔ گو ان کی رائیں اس عہد میں پوری طرح مدون نہ ہو سکی تھیں لیکن متاخرین فقہائے حنابلہ کی کتابوں میں یہ رائیں نہایت تفصیل سے نقل کی گئی ہیں جیسے ابن قدامہ المقدسی کی المقنع اور المغنی جن سے مدد لینے میں کوئی مضائقہ نہ تھا جب کہ فقہ حنفی کے سلسلہ میں خود انھوں نے اپنے بیان کردہ متعینہ عہد کے مآخذ و مراجع کی پابندی نہیں کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے امام سرخسی (متوفی ۴۸۳ھ) کی المبسوط اور علامہ کاسانی (متوفی ۵۸۷ھ) کی بدائع الصنائع کے حوالے دیے ہیں۔ اس لیے وہ حنبلی مسلک کے سلسلہ میں بھی ایسا کر سکتے تھے۔ جس کے بعد وہ ان بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہتے، جن کے وہ مرتکب ہو گئے ہیں۔ ہمارے خیال میں اسلامی فقہ سے متعلق انکی بعض غلط رائیں دراصل حنبلی مسلک سے انکی ناواقفیت ہی کا نتیجہ ہیں۔ اگر اس مسلک کا انھوں نے باقاعدہ مطالعہ کیا ہوتا تو یہ غلطیاں ان سے نہ سرزد ہوتیں۔ مجموعی حیثیت سے گو یہ کتاب مفید ہے، لیکن اس میں جو خامیاں رہ گئی ہیں ہمکو امید ہے کہ ان کو فاضل مصنف اپنی انصاف پسندی سے آیندہ اڈیشن میں اصلاح فرما دیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط

امراء و سلاطین کے نام

از
ڈاکٹر عبداللطیف کانو

مترجم:۔ جناب فیضان اللہ فاروقی لکچرر شعبہ عربی سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز حیدر آباد

(۲)

نامۂ مبارک کسریٰ شاہ فارس کے نام مضمون:۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد رسول اللہ کی طرف سے کسریٰ شاہ فارس کے نام۔ سلامتی ہو۔ اس پر جس نے ہدایت کی راہ اختیار کی۔ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا۔ اور اس بات کی شہادت دی کہ اللہ ایک ہی ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں تمھیں اُن باتوں کی طرف بُلاتا ہوں جنکی دعوت خود اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ اللہ نے مجھے ساری مخلوق کے لیے رسول بنایا ہے۔ تاکہ وہ لوگ جو زمین پر چل پھر رہے ہیں۔ انھیں اللہ کے عذاب سے خوف دلاؤں۔ اس دعوت سے روگردانی کرنے والوں کے لیے اللہ کا (عذاب کا) فیصلہ اٹل ہے۔ وہ پورا ہو کر رہے گا۔ تم اسلام قبول کر لو تو نجات پاؤگے۔ اور اگر انکار کروگے تو تمھارے ہم قوم آتش پرستوں کا عذاب بھی تم ہی پر ہوگا۔

- رسالة النبي صلى الله عليه وسلم الى كسرى انو شروان حملها اليه الصحابي عبدالله بن حذافة السهمي

سفیر کا تعارف

حضرت عبداللہ بن حذافہؓ بن قیس السہمی القرشی ابتدا ہی میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ انھوں نے اسلام کی نشر و اشاعت میں بڑا حصہ لیا۔ اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریب رہنے کا بھی زیادہ موقع ملا۔ حضرت حفصہ بنت عمرؓ کے شوہر جو اُن کے بھائی تھے۔ ان کے ہمراہ حبشہ کی دوسری ہجرت میں شریک ہوئے۔ یہ غزوۂ بدر میں بھی شریک تھے۔ حضرت عبداللہ ابن حذافہ منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ انھیں سیر و سیاحت کا اچھا تجربہ تھا۔ حبشہ کی ہجرت پہلے ہی فرما چکے تھے۔ مصر سے بھی واقفیت تھی۔ اس سلسلہ میں ایرانی سلطنت کے متعدد شہروں سے بھی ان کا بار بار گذر ہوتا تھا۔ یہی ظاہری اسباب تھے۔ جن کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سفارت کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ایک بار وہ اہل روم کے ہاتھوں قید بھی ہو گئے تھے۔ نصرانیت قبول کر لینے کے لیے ان کو بہت مجبور کیا گیا۔ اور اس سلسلہ میں ان کو ایذا بھی دی گئی۔ لیکن ان کا جواب صرف جرأت مندانہ انکار رہا۔ اسی غیر متزلزل انکاری جواب کا اثر تھا۔ جس نے ان کو مع اُسی رفقا کے اہل روم کی قید سے نجات دلائی۔ رہائی کے بعد جب واپس تشریف لائے۔ تو حضرت عمرؓ نے ان کا سر چوم لیا۔ وہ بیک وقت جنگ آزما مجاہد بھی تھے۔ خوش کلام شاعر بھی۔ ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ مزاج میں خوشگوار مزاح بھی تھا۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ کا ان کو امیر مقرر فرمایا۔ انھوں نے اہل سریہ کو لکڑی جمع کرنے کا حکم دیا۔ پھر آگ جلا کر ان لوگوں کو حکم دیا کہ اس میں داخل ہو جاؤ۔ لوگوں نے انکار کیا تو فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم لوگوں کو میری اطاعت کا حکم دیا ہے۔ پھر حدیث شریف سنائی کہ جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے گویا میری اطاعت کی۔ اس دلیل کو سن کر ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہم آگ سے نجات ہی کے لیے تو اللہ اور رسولؐ پر ایمان لائے ہیں۔ اور آپ ہمیں آگ ہی میں جھونک رہے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ تو آپ نے لوگوں کے اس فعل
(انکار) کو درست قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت کے کاموں میں کسی مخلوق
کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ اس سفارتی فریضے کی ادائیگی کے بعد حضرت عبداللہ بن حذافہؓ تقریباً
۲۰ سال زندہ رہے۔ فتح مصر کے بعد وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ اور حضرت عثمانؓ کے عہد
خلافت میں ۳۳ھ مطابق ۶۵۳ء کے قریب وفات ہوئی۔

سفارت کی تفصیل | نامۂ مبارک جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر مبارک سے آراستہ تھا لے
حضرت عبداللہ بن حذافہؓ محرم ۷ھ کے اوائل میں پرویز بن ہرمز بن انوشیروان شاہ
فارس کے نام لیکر روانہ ہوئے۔ انھوں نے براہ بحرین سفر فرمایا۔ بڑی زحمت و مشقت کے
بعد دیوان کسریٰ تک پہونچے۔ اور بادشاہ کے سامنے حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ تاکہ رسائل
نبویؐ براہ راست شاہ فارس کو دے سکیں۔ گورنر نے کہا کہ وہ خط اسے دیدیں، کسریٰ تک پہونچا
دیا جائے گا۔ حضرت عبداللہؓ نے بذات خود دربار میں حاضر ہو کر اپنے ہاتھ سے خط دینے پر اصرار کیا۔ جب
اجازت مل گئی تو حسب فرمان نبویؐ خط کسریٰ کے حوالے کیا۔ اور اس کے سامنے حسب ذیل
تقریر فرمائی "اے اہل فارس ایک عرصے سے تم لوگ اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گذار
رہے ہو۔ تم میں کوئی نبی تھا نہ اللہ کی کتاب۔" پھر انھوں نے براہ راست بادشاہ کو مخاطب فرما کر
کہا۔ "اے شاہ تم زمین کے صرف اتنے ہی حصے کے مالک ہو جو تمھارے قبضۂ اقتدار میں ہے لیکن وہ جو
تمھارے قبضے میں نہیں ہے۔ وہ تمھاری حکومت کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ تم سے پہلے دیندار
اور دنیادار دونوں طرح کے بادشاہ گذر چکے ہیں۔ دینداروں نے دنیا سے بھی پورا پورا لطف اٹھایا،
آخرت تو ان کی تھی ہی۔ لیکن دنیادار بادشاہوں نے اپنی آخرت ضایع کر دی۔ دنیاوی جدو
جہد ان میں سے کسی نے کم، کسی نے زیادہ کی۔ لیکن آخرت کا انصاف ہر ایک کے لیے ایک جیسا ہے،

یہ حقیقت شاید تمھارے لئے غیر اہم ہو۔ لیکن اسکا تذکرہ صرف اس لئے کیا گیا کہ تم شاید نصیحت و عبرت
حاصل کرو۔ قانون خداوندی نافذ ہو کر رہے گا۔ اس کی تکذیب کر کے تم اس کی دسترس سے نکل نہیں سکتے،
نہ ہی اس سے صرف نظر تمھاری مدافعت کر سکے گا' جنگ ذی قار کا عبرت ناک واقعہ تمھاری آنکھ
کھولنے کے لئے کافی ہے۔"

کسریٰ نے یہ جرأتمندانہ تقریر سُنی۔ نامۂ رسول اللہؐ ہاتھ میں لیا اور اسے پھاڑ ڈالا۔ پھر کہنے لگا
کہ میرے پاس ایک زرخیز ملک ہے۔ جس کا میں بلا شرکت غیرے مالک ہوں۔ فرعون نے بنی اسرائیل
پر حکومت کی جب کہ تم عرب قوم بنی اسرائیل سے کمتر درجہ کے ہو۔ پھر بھلا میں تم پر کیوں نہ حکومت
کروں، جب کہ میں فرعون سے کہیں افضل ہوں۔ اور یہ بادشاہ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)
تو اسے تو کتے نوچ کر کھائیں گے۔ (نعوذ باللہ) تم اہل عرب تو وہی قوم ہو جن کے شکم آسودہ
ہو جاتے ہیں۔ لیکن آنکھیں بوجہ حرص و طمع کے نہیں بھرتیں۔ جنگ ذی قار سے میرا کوئی تعلق نہیں
وہ ملک شام میں ہوئی تھی۔

اس تلخ گفتگو کے بعد حضرت عبداللہ بن حذافہؓ واپس لوٹ آئے اس روایت سے صاف پتہ چلتا ہے۔
کہ انھوں نے کسریٰ سے ملاقات بھی کی اور اس سے بحث و مباحثہ بھی ہوا۔

کسریٰ کا ردعمل | اس نامۂ مبارک سے کسریٰ بہت غضبناک ہوا۔ اپنے یمن کے گورنر باذان
کو اس نے حکم دیا کہ دو پیادے حجاز روانہ کرے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کر کے میرے
پاس بھیج دے۔ باذان نے حسب الحکم اپنے معتمد خاص کے ساتھ ایک دوسرا آدمی جس کا نام
خرخسرہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس روانہ کیا۔ اور لکھا کہ آپ ان دونوں کے
ہمراہ کسریٰ کے دربار میں حاضر ہو جائیں۔ یہ دونوں مدینہ حاضر ہو کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے،
آپؐ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ جاؤ کسریٰ کو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا۔ واپس ہو کر ان دونوں نے

باذان کو یہ خبر دی۔ باذان نے سنکر کہا کہ یہ کسی بادشاہ کا کلام نہیں ہے۔ یقیناً آپؐ نبی ہیں۔ جب
اس پیش گوئی کی تصدیق ہوئی تو باذان مسلمان ہو گیا۔ ساتھ ہی اس کے تمام ساتھی حلقہ بگوشِ اسلام
ہو گئے۔ کسریٰ کا جواب نہایت سخت ناخوشگوار عقل و فہم اور سیاست سے خالی ہے۔ سرکشی اور
جہالت سے بھرا ہوا ہے۔ پھر بھی اس نے اتنی رعایت ضرور کی کہ قاصد کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ خود رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو طلب کیا۔ اہل فارس اس نامۂ مبارک کے ذریعہ ایمان نہ لائے۔ لیکن کسریٰ
کا عامل باذان مع اپنے رفقاء کے مسلمان ہوا۔

نامۂ مبارک کا رسم خط اور دیگر مواد

ابتدائی طور پر صاف کی ہوئی کھال پر سیاہ روشنائی
سے یہ نامۂ مبارک تحریر کیا گیا ہے۔ کسی طرح کی تزئین و آرائش اس میں نہیں ہے۔ نہ ہی نقطوں
اور حرکات کا استعمال ہے۔ خط کے ایک تہائی حصے کے قریب بائیں طرف مہر نبویؐ ثبت ہے۔
دوسرے خطوط کے مقابلہ میں اس خط میں مہر کچھ اوپر لگائی گئی ہے۔ ابتدائی مدنی رسم الخط میں
لکھا گیا ہے۔ حروف اکھڑے اکھڑے سے ہیں۔ سطریں سیدھی نہیں ہیں۔ یہ خط کے بائیں جانب
اوپر اٹھتی چلی گئی ہیں۔ بغیر لائن کھینچے ہوئے سادہ کاغذ پر سطروں کا نیچے اوپر ہو جانا عام الوقوع
ہے۔ خط کے بہت سے کلمات اپنی اصلی ہیئت میں جدا جدا نظر آتے ہیں۔ کتابت باریک اور صاف
ہے۔ اس عہد کی دوسری تحریروں کا مقابلہ اس خط کی تحریر سے کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ اس خط میں اس
عہد کے مروج مدنی رسم الخط کے اصول کی پوری پابندی کی گئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کتابت غیر متناسب
ہے۔ حروف میں باہمی تناسب کا فقدان ہے۔ مستطیل شکل کی کھال پر یہ خط تحریر کیا گیا ہے۔ جب کہ
دوسرے نامہ ہائے مبارک مستطیل نہیں ہیں۔ طول تقریباً ۴۲ سنٹی میٹر ہے۔ اور عرض تقریباً ۲۲
سنٹی میٹر۔ کل پندرہ (۱۵) سطرہ اور ۶۲ کلمات ہیں۔ جس میں مہر کے تین کلمات بھی شامل ہیں۔ آج
اس خط کی موجودگی ایک قابل غور مسئلہ ہے۔ کیونکہ یہ بات ہر طرح ثابت ہے کہ کسریٰ نے

خط پھاڑ دیا تھا۔ پھر اس کا پایا جانا کیونکر ممکن ہے۔ خط کی عکسی تصویر دیکھنے سے صاف پتہ
چلتا ہے کہ اسے پھاڑا ضرور گیا ہے۔ لیکن پوری طرح پھٹ نہیں سکا ہے۔ کیونکہ تصویر میں
اوپر سے نیچے کی طرف ایک چاک سا معلوم ہوتا ہے۔ جو خط کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوا
چلا گیا ہے۔ اس لئے خط کے اکثر حروف پڑھے جانے کے لائق نہیں رہ گئے ہیں۔ اسی طرح اوپر
بائیں کی طرف جہاں سے خط پھاڑا گیا ہے۔ وہاں کے حروف کم و بیش تلف ہو گئے ہیں۔ ایسا
لگتا ہے۔ کہ کسریٰ نے خط پرزے پرزے کر دینا چاہا تھا۔ جیسا کہ غیر ضروری کاغذات کے
ساتھ ہم لوگ بھی کرتے ہیں۔ لیکن چمڑا اتنی آسانی سے نہیں پھٹ سکا۔ بالخصوص وہ چمڑا جسے
صرف ابتدائی دباغت دی گئی ہو۔ اس لیے کسریٰ خط اوپر کی طرف سے صرف تھوڑا
سا پھاڑ سکا۔ پھر اس نے نامۂ مبارک توڑ مروڑ کر پھینک دیا ہوگا۔ اور پھر حاضرین دربار
یا محافظوں میں سے کسی نے اسے محفوظ کر لیا ہوگا۔ حقیقت امر جو بھی ہو۔ اتنی بات واضح ہے۔
کہ ابتدائی مراحل میں یہ خط جس حالت کو پہونچ چکا تھا۔ (جس کے اثرات آج بھی موجود ہیں)
اس سے عیاں ہے کہ اس دولت نایاب کی حفاظت بعد میں بھی ٹھیک طرح نہیں کی گئی۔
بہت سے کلمات مٹ گئے ہیں۔ اور اطراف جگہ جگہ سے کرم خوردہ ہیں۔

مشہور مصری اخبار الاہرام کی ۱۵ مئی ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں مارچ ۱۹۳۱ء میں
اس خط کے انکشاف کی خبر شائع ہوئی تھی۔ اس کے مطابق شام کے شہر حلب میں یہ خط
دریافت ہوا تھا۔ ظن غالب ہے۔ کہ یہ خط اپنے محقق کی تحویل میں رہا ہوگا۔ پھر ۳۴ سال بعد
مشہور محقق اور ماہر تحریر ڈاکٹر صلاح الدین المنجد نے ۱۹۶۵ء میں بیروت میں اسے دوبارہ
دریافت کیا۔ اس تحقیق و تلاش میں ان کے رفیق کار ڈاکٹر ہنری فرعون بھی تھے۔ ...
لیکن فی الحال یہ خط کہاں ہے۔ یہ بتانا سخت مشکل ہے۔ بالخصوص لبنان کے سیاسی حالات

کی روشنی میں جن سے وہ ان دنوں دوچار ہے۔ قیاس ہے کہ اس خط کو بغرض حفاظت فرانس منتقل کر دیا گیا ہے۔

مکتوب گرامی مقوقس شاہ قبط کے نام مضمون۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے مقوقس شاہ قبط کے نام۔ سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت مان لی۔ اما بعد! میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام لاؤ، سلامت رہو گے۔ اللہ تم کو دوچند اجر عنایت کرے گا۔ اور اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تم پر تمھارے ہم قوم لوگوں کا عذاب بھی ہوگا۔ اس کے بعد قرآن کی آیات یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بأنا مسلمون

محمد رسول اللہ

سفیر کا تعارف حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ اللخمی یہ نامۂ گرامی قدر لیکر گئے تھے۔ وہ یمن کے رہنے والے تھے۔ اور اصحاب بدر میں سے ہیں۔ دوسرے تمام غزوات میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ بہترین تیرانداز اور جاہلیت کے دنوں میں قریش کے ماہر شہسوار اور شاعر تھے اسلام لانے سے پہلے تجارت کرتے تھے۔ تجارت کے لیے سفر کرنے کی وجہ سے اس کا اچھا تجربہ تھا، قوی تنومند، سخت گیر بہادر تھے۔ اپنے غلاموں پر سختی کرتے چنانچہ ایک بار ان کے ایک غلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایۃً کہا کہ حاطب جنت میں نہیں جا سکتے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ جو بدر اور حدیبیہ میں شریک ہوا ہے، جہنم میں ہرگز نہیں جائے گا۔ طرز گفتگو نہایت دلنشیں تھا۔ مقوقس سے ان کی گفتگو نہایت مدلل، ٹھوس اور کافی دشافی تھی. سفارت کے وقت عمر شریف تقریباً ۴۰ سال تھی۔ ۳۰ھ مطابق ۶۵۰ء میں وفات ہوئی۔

ہجرت سے تقریباً ۳۵ سال قبل ولادت ہوئی تھی۔ اور اس سفارت کے کوئی ۲۳ سال بعد ۶۵ سال کی عمر میں وفات ہوئی۔ حضرت عثمانؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور مدینہ منورہ میں تدفین ہوئی۔

سفارت کی تفصیل حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ سربمہر مکتوب گرامی لے کر اسکندریہ کی طرف روانہ ہوئے۔ شاہ قبط جریج بن مینا اس وقت پانی پر تیرتے ہوئے دربار میں مجلس جمائے ہوئے تھا۔ یہ بھی سوار ہو کر وہیں پہونچ گئے۔ قریب ہوئے تو نامۂ مبارک انگلیوں میں دبا کر شاہ کی طرف اشارہ کیا۔ مقوقس نے دیکھا تو قریب بلالیا۔ خط پڑھکر حسب ذیل گفتگو کی۔

مقوقس :۔ اگر وہ نبی ہیں تو پھر میرے حق میں بددعا کیوں نہ کر دی۔ اس طرح وہ بغیر مشقت کے مجھ پر غلبہ پا لیتے۔

حضرت حاطبؓ :۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے دشمنوں اور منکرین کے خلاف بددعا کرنے سے کس چیز نے روکا تھا۔ ؟

مقوقس۔ یہ جواب سن کر کچھ دیر کے لیے حیران رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر وہی سوال کیا۔ انھوں نے دوبارہ وہی جواب دیا۔ اب مقوقس خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت حاطبؓ نے اپنی تقریر شروع فرمائی۔ کہ اے شاہ! تم سے پہلے ایک بادشاہ یہاں گذرا ہے۔ جس نے رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اللہ نے اُسے دنیا اور آخرت، دونوں جگہ سزا دی۔ اس لیے اے شاہ تم دوسرے کے انجام سے عبرت حاصل کرو۔ اور دوسروں کو اپنے انجام سے عبرت حاصل کرنے کا موقع نہ دو۔

مقوقس :۔ ہم ایک دین کے ماننے والے ہیں۔ تو جب تک کوئی دوسرا دین ہمارے

اپنے دین سے اچھا ثابت نہ ہو جائے ہم کیونکر اپنا دین چھوڑ دیں۔

حضرت حاطبؓ :۔ ہم تمھیں اللہ کے دین کی دعوت دیتے ہیں۔ اور اب وہ صرف اسلام ہے۔ اللہ تعالےٰ اس کی حفاظت اور سرپرستی کے لیے کافی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس دین کی دعوت دی تو سب سے زیادہ مخالفت قریش نے کی اور سب سے زیادہ بغض وعناد کا مظاہرہ یہود نے کیا۔ لیکن نصاریٰ رسول اکرمؐ سے نسبتاً قریب رہے بخدا حضرت موسیٰ کی بشارت حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ویسی ہی ہے۔ جیسی حضرت عیسیٰؑ کی بشارت رسول اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اور ہماری قرآن کی دعوت . . . اسی طرح کی ہے۔ جیسے تم اہل توریت کو انجیل کے فرمودات پر عمل کی دعوت دیتے ہو۔ جس قوم نے کسی نبی کا عہد پایا ہو۔ اس پر نبی کی اطاعت فرض ہے۔ اس لیے تم پر بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرض ہے۔ اسلام کی دعوت کا مطلب عیسائیت سے ہٹنا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت یہ دعوت عیسائیت ہی کی دعوت ہے۔

مقوقس :۔ میں نے اس نبی کی باتوں کا جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہونچا کہ ان کی ترغیب کے احکام دلا دیتے ہیں۔ اور جن باتوں سے منع کرتے ہیں یعنی احکام نواہی تو وہ وہی ہوتے ہیں۔ جن کا ارتکاب طبعاً ناپسندیدہ ہے۔ نہ تو آپ گم کردہ راہ۔ جادوگر ہیں نہ ہی جھوٹے کاہن ہیں۔ میں نے ان کے پاس نبوت کی نشانیاں بھی پائی ہیں کہ وہ غیب کی باتیں بتا دیتے ہیں۔ اور سرگوشیوں کی اطلاع بھی دیتے ہیں۔ میں غور کروں گا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اور پھر جواب دونگا۔

اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ قبط مقوقس مثبت طرز فکر کا حامل تھا۔ صاحب عقل وفکر تھا۔ معاملات کی تہ تک پہونچکر اسے پوری طرح سمجھکر کوئی فیصلہ کرتا تھا۔ اسلام کی دولت سے وہ بے بہرہ رہا۔ لیکن اسے توقع تھی کہ ملک شام میں نبی آخر الزماںؐ کا ظہور ہوگا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے قاصد کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور باتیں توجہ سے سنیں ان سے تفصیلی گفتگو کی۔ اسلام کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں حضرت حاطبؓ اور مقوقس کی بہت طویل گفتگو ہوئی، اس میں حضرت حاطبؓ نے اسلام کے ارکان و اصول مقوقس کو اچھی طرح سمجھائے۔ آخر میں مقوقس نے حضرت حاطبؓ سے کہا کہ میرا خیال ہے کہ میری قوم کے لوگ اسلام قبول کرنے میں میرا ساتھ نہیں دیں گے۔ نہ ہی میری بات مانیں گے۔ اسلئے آپ میری اس بات کو راز رکھئے گا۔

ردعمل | حضرت حاطبؓ مقوقس کا جوابی خط لیکر دربار رسالت میں حاضر ہوئے۔ مقوقس نے بطور ہدیہ ۲ باندیاں کچھ کپڑے اور سواری کے لئے ایک خچر ارسال کیا تھا۔ اسکے خط کا مضمون حسب ذیل ہے:

" محمدؐ بن عبداللہ کے نام مقوقس شاہ قبط کی طرف سے۔ السلام علیک میں نے آپ کا خط پڑھا۔ اور اس کے مندرجات سے مطلع ہوا۔ آپ کی دعوت سے بھی آگاہی ہوئی۔ یہ مجھے معلوم ہے کہ نبی آخر الزماں کا ظہور ابھی ہونا ہے، لیکن میرے خیال میں وہ ملک شام میں ظاہر ہوں گے۔ آپ کے قاصد کی میں نے عزت کی ہے۔ آپ کے لیے بطور تحفہ قبط کی ۲ نفیس باندیاں کچھ کپڑے اور سواری کے لیے ایک خچر ارسال ہے "

والسلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے ایک باندی سے عقد فرمایا یہ ام المومنین حضرت ماریہ قبطیہ رضؓ تھیں۔ یہ اسلام لائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم انہی کے بطن سے تھے۔ دوسری باندی جن کا نام سیرین تھا۔ انھیں مشہور شاعر حضرت حسان بن ثابت انصاری رضؓ کو دیدیا۔ خچر جس کا نام دلدل تھا۔ وہ حضرت معاویہ رضؓ کے عہد تک زندہ رہا۔

نامۂ مبارک کا رسم الخط اور اس کے دیگر مواد | یہ نامۂ مبارک ابتدائی دباغت دیئے ہوئے چمڑے پر سیاہ روشنائی سے تحریر کیا گیا ہے۔ تزئین و آرائش سے پاک ہے۔ نقطوں اور حرکات کا استعمال نہیں ہے۔ خط کے داہنی جانب سے ربع اوّل کے قریب مہر رسالت لگائی گئی ہے۔ رسم الخط مدنی ہے۔ کتابت نہایت نفیس ہے۔ سطریں متناسب اور سیدھی ہیں۔ کلمات پوری طرح واضح اور صاف ہیں انھیں آسانی سے پڑھا جاسکتا ہے۔ یہ انہی صحابۂ کرام میں سے کسی ایک کی تحریر ہوسکتی ہے۔ جو خدمت کتابت پر مستقلاً مامور تھے۔ اس خط اور ہرقل کے نام لکھے ہوئے خط میں بہت مماثلت ہے۔ اگر دونوں تحریروں میں چند واضح فرق بالخصوص خط کی باریکی اور موٹائی کا فرق نہ ہوتا تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ دونوں تحریریں ایک کاتب کی ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں تحریریں کئی باتوں میں مشترک ہیں۔ مثلاً

دونوں کی کتابت بہت کچی ہوئی باریک اور صاف ہے۔ حروف بہ آسانی پڑھے جاسکتے ہیں۔ سطروں اور کلمات کے درمیان تناسب کی رعایت دونوں تحریروں میں ہے۔ دونوں میں مہر بائیں جانب لگائی گئی ہے۔ خط میں ۱۲ سطریں ہیں۔ اور مہر رسالت کے بشمول ۱۰۰ کلمات ہیں۔ مستطیل شکل کی کھال پر لکھا گیا ہے۔ جس کی پیمائش ۵ء۳۲ × ۳۰ سنٹی میٹر ہے۔ عصر حدیث میں دریافت ہونے والے رسائل نبویؐ میں مقوقس کے نام تحریر کیا ہوا خط پہلا خط ہے۔ جسے فرانسیسی مستشرق بارشلیمہ نے مصر علیا کے گرجا اخمیم سے ۱۸۵۰ء میں دریافت کیا۔ یہ خط ایک قدیم قبطی انجیل کے غلاف میں لپٹا ہوا تھا۔ دریافت ہونے کے بعد اسے سلطان عبدالحمید کو پیش کیا گیا۔ سلطان نے اسے سونے کے فریم میں لگا کر ایک نہایت نفیس بیش قیمت موتی کے صندوق میں رکھا۔ آج بھی یہ متاع گرانقدر استنبول کے میوزیم طوب قپو کے شعبۂ امانات مقدسہ میں محفوظ ہے۔

نجاشی ملک حبشہ کے نام مکتوب گرامی | مضمون۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد رسول اللہؐ کی جانب سے نجاشی شاہ حبشہ کے نام السلام علیک! میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں۔ جس کے سوا دوسرا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ صاحب ملک و قدرت ہے۔ نہایت پاک و برتر اور سراپا سلامتی ہے۔ پناہ دینے والا ہے۔ اور رعب و جلال والا ہے۔ میں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰ بن مریم روح اللہ اور اللہ کا ایک کلمہ ہیں۔ جسے اللہ نے عفت مآب مریمؑ کو مرحمت فرمایا۔ اس طرح حضرت مریمؑ نے حضرت عیسیٰؑ کو جنم دیا۔ حضرت عیسیٰؑ اللہ تعالیٰ کی روح ہیں۔ جسے اللہ نے حضرت مریمؑ کی طرف پھونک دیا۔ اس سے وہ حاملہ ہوئیں۔ یہ اسی طرح ہوا جیسے اللہ نے حضرت آدمؑ کو اپنے دست قدرت سے بنایا۔ اور اس میں روح پھونکی۔ میں تم کو خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دیتا ہوں ساتھ ہی اس کی بندگی پر دوام اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں اگر تم میری بات مان لوگے اور میری شریعت پر ایمان لاؤگے تو جان لو کہ میں اللہ کا سچا رسول ہوں اپنے چچا زاد بھائی جعفرؓ کو مع چند ساتھیوں کے روانہ کر رہا ہوں۔ یہ لوگ جب تمہارے پاس پہونچیں تو ان کی اچھی طرح خاطر کرنا۔ اور تکبر و عناد کا راستہ چھوڑ دو۔ میں تمھیں اور تمھاری قوم کو اللہ کی اطاعت کی طرف۔ اللہ کا پیغام میں نے تمھیں پہونچادیا، اور نصیحت بھی کر چکا۔ اسے توجہ سے قبول سنو۔ سلامتی ہو۔ اس پر جس نے ہدایت کا راستہ اختیار کیا۔

اللہ
رسول
محمد

قاصد کا تعارف | جلیل القدر صحابی حضرت عمرو بن امیۃ الضمریؓ اس نامۂ مبارک کو لے کر نجاشی اصحم بن ابحر کے پاس گئے۔ اسلام کی دعوت بذریعہ تحریر دینے والے یہ پہلے شخص ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کی حیثیت سے روانہ ہوئے۔ زمانہ جاہلیت میں حضرت عمروؓ بن امیۃ کفر کے لیے ایک مضبوط طاقت کی حیثیت رکھتے تھے۔ غزوۂ بدر اور احد میں کافروں کے ساتھ تھے۔ غزوۂ احد کے

بعد اسلام لائے۔[1] نسلاً حجازی تھے۔ شجاعت اور دلیرانہ اقدام کے لیے مشہور تھے، ان کی شجاعت اور تجربہ کاری کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اپنے معاملات میں بحیثیت سفیر بھیجا کرتے تھے۔ سب سے پہلی بار ۴ھ میں غزوۂ بیر معونہ میں شریک ہوئے پھر متعدد غزوات میں شرکت فرمائی۔ اس سے ان کی جنگی مہارت اور پختہ کاری کی بہت شہرت ہوئی۔ یہ بہت چاق و چوبند، شجاع و قوی اور جنگ جو تھے۔ بارگاہ نبوی میں بھی ان کا ایک مخصوص درجہ تھا، اور ان کا لقب "ساعی النبیؐ" پڑ گیا تھا۔ پہلے حبشہ کی ہجرت فرمائی، پھر مدینہ حاضر ہوئے۔ حبشی زبان اچھی طرح جانتے رہے ہوں گے۔ کیونکہ اہل حبشہ کے ساتھ رہنے کا ان کو کافی موقع ملا تھا۔ ۵۵ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ یہ حضرت معاویہؓ کا عہد تھا۔ وفات کے وقت اس سفارت کے ۴۸ سال پورے ہو چکے تھے۔

سفارت کی تفصیل: نجاشی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کا پرتپاک خیر مقدم کیا، خط کو آنکھوں سے لگایا ساتھ ہی اپنے تخت شاہی سے نیچے اتر آیا۔ یہ والہانہ وابستگی اور تواضع اشارہ کرتی ہے۔ کہ نجاشی نے اسی وقت مخفی طور پر اسلام قبول کر لیا تھا۔ جب مسلمان پہلی بار ہجرت کر کے حبشہ پہونچے تھے یہ ہجرت مدینہ کی ہجرت سے ۸ سال پہلے ہوئی تھی اس طرح اس خط اور پہلی ہجرت کے درمیان ۱۴ سال کی مدت ہے۔ یہ عرصہ اسلام اور اصول اسلام سے پوری طرح واقفیت کیلئے کافی ہے، نجاشی کے دربار کا وہ مشہور مناظرہ جس میں حضرت عمروؓ بن العاص قریش کی طرف سے مطالبہ کرنے حاضر ہوئے تھے، کہ حبشہ کو ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو قریش کے حوالے کر دیا جائے۔ اور نجاشی نے مسلمانوں کی جوابی تقریر سنکر واپسی سے صاف انکار کر دیا تھا۔ یہ مناظرہ بجائے خود اسلام کی حقیقت سمجھنے کے لیے ایک اچھا ذریعہ تھا۔

---

[1] معلی۔ ابن اثیر نے اسد الغابہ میں یہی لکھا ہے، مگر مشہور قول یہ ہے کہ وہ غزوۂ احد کے بعد ایمان لائے۔

نجاشی کا جواب نجاشی شاہ حبشہ نے مسلمانوں کو پہلے دن سے اپنی قلمرو میں رہنے کی سہولت دی۔ دین اسلام کا وافر مطالعہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ آخری آسمانی مذہب یہی ہے، اس لیے اس نے مسلمانوں سے مہربانی کا معاملہ کیا۔ اور ان کی ہر طرح مدد کی؛ عربی ذرائع کا خیال ہے کہ نجاشی نے نامۂ مبارک کا بوسہ دینے کے بعد کلمۂ شہادت پڑھا تھا۔ اور باقاعدہ مسلمان ہو گیا تھا، اس نے جوابی خط بھی لکھا تھا۔ جس میں اپنے اسلام کا اقرار کیا تھا، ساتھ ہی بطور ہدیہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کچھ کپڑے بھی ارسال کیے تھے جنھیں آپ نے قبول فرمایا تھا۔

عرب کے دوسرے امراء کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رسائل

عمان کے دو یمنی رئیس جیفر اور عبد بنی الجلندی کے نام:۔

مضمون:۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

محمد عبد اللہ و رسولہٗ کی جانب سے جلندی کے دونوں صاحبزادوں جیفر اور عبد کے نام۔ سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت کا راستہ اپنایا۔ میں تم دونوں کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اسلام قبول کر لو تو ہر طرح محفوظ اور سلامتی سے رہو گے۔ میں ساری انسانیت کے لیے اللہ کی طرف سے رسول ہوں۔ زندہ لوگوں کو عذاب خداوندی سے ڈرانا میرا کام ہے۔ جس نے انکار کا راستہ اختیار کیا۔ اس کے لیے عذاب یقینی ہے، اگر تم اسلام کا اقرار کرتے ہو تو میں تم دونوں کا سرپرست ہوں۔ انکار کرتے ہو تو سمجھ لو کہ تمہارا ملک تمہارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ ہمارے گھوڑے تمہارے صحن تک پہونچکر رہیں گے۔ اور میری نبوت تمہارے ملک پر غالب آکر رہے گی۔

محمد رسول اللہ

سفیر کا تعارف حضرت عمروؓ بن العاص السہمی قریشی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ یہ

جاہلیت میں اسلام کے سخت مخالفین میں سے تھے۔ اسلام لانے کے بعد ایک بہادر اور کامیاب قائد کی حیثیت سے ان کی شخصیت سامنے آئی۔ معرکہ اجنادین میں فلسطین کی بازنطینی حکومت پر فتح حاصل کی۔ اہل حلب سے سیاسی صلح کی۔ مصر فتح کیا۔ اسکندریہ پر قبضہ کیا۔ صلح حدیبیہ کی بیعت میں شریک تھے۔ اس بیعت کا ذکر خود انھوں نے اس طرح فرمایا ہے۔

"پہلے خالد بن ولید آگے بڑھے اور بیعت کی، پھر عثمان بن طلحہ نے بیعت کی۔ پھر میں آگے بڑھا۔ اس وقت صرف یہ ہوا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو بیٹھ گیا۔ شرم سے سر اٹھانے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ بیعت کرتے وقت درخواست کی کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے گذشتہ گناہوں کے لیے دعائے مغفرت فرما دیں۔ آئندہ گناہوں کی مغفرت کے لئے دعا کی درخواست کا خیال ہی نہیں آیا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن العاص کو زرہ پوش لشکر کا کمانڈر مقرر فرمایا تھا۔ پھر عمان کا گورنر مقرر فرمایا۔ کاتبین وحی میں سے بھی تھے، انھوں نے بارگاہ رسالت کی دیگر تحریری خدمات بھی انجام دیں۔ عرب کے انتہائی ذکی اور ذہین لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ فہم و فراست میں بے مثال تھے، ایسا صائب الرائے عرب میں کم پیدا ہوا۔ حضرت عمر نے ایک بار ایک شخص سے جس کی عقل میں کچھ ضعف آگیا تھا، کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرا اور عمرو بن العاص کا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے۔ گویا انھوں نے یہ بتانا چاہا کہ اللہ تعالیٰ خلاق اضداد ہے۔ حضرت عمرو بن العاص سفر کا اچھا تجربہ رکھتے تھے۔ سمندری سفر بھی کر چکے تھے۔ صاحب تجارت و مال و جاہ تھے۔ حبشہ کا سفر بھی کیا تھا۔ اور نجاشی سے گفتگو بھی کی تھی، اسلام سے پہلے مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ اسلام لانے کے بعد

اسلامی لشکر کے قائد اور سپہ سالار ہو گئے تھے حضرت عمر کے زمانے میں مصر و فلسطین کے گورنر رہے۔ حضرت عثمان کے عہد میں معزول کر دیئے گئے۔ پھر حضرت امیر معاویہ نے ان کو مصر کی ولایت پر دوبارہ بحال کیا۔ یہ مکہ مکرمہ میں ہجرت سے پچاس سال قبل سنہ ۵۷۳ء میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما ہوئی۔ قریشی الاصل، فصیح و بلیغ، مدلل اور ٹھوس طرز گفتگو کے مالک تھے۔ اسی لیے ان کا انتخاب اس سفارت کے لیے بارگاہ رسالت سے ہوا۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ عمرو بن العاص ماہ ذی قعدہ ۸ھ میں روانہ ہوئے۔ اس طرح ان کی عمر اس وقت ۵۸ سال تھی۔ اس کے بعد مزید ۳۵ سال زندہ رہے۔ مصر میں ۴۳ھ مطابق سنہ ۶۶۳ء میں وفات ہوئی، عمر شریف تقریباً ۹۳ سال تھی۔ مقطم میں تدفین ہوئی۔ ان کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

سفارت کی تفصیل | اس کی کیفیت خود حضرت عمرو بن العاص نے یوں بیان کی ہے۔

"میں مدینہ سے چلکر سیدھا عمان پہونچا۔ اور پہلے عبد سے ملنے کا قصد کیا۔ وہ نہایت خوش اخلاق اور بردبار تھا۔ ملاقات کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ میرے بھائی جیفر عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ اور حکومت میں بھی اولیت انہی کو ہے۔ آپ کو ان کے پاس بھیج دیتا ہوں تاکہ آپ کا پیام پڑھ لیں۔ جیفر کے پاس پہونچے تو باریابی کے لیے کچھ دیر باہر ہی انتظار کرنا پڑا، اس درمیان میں چھوٹے بھائی نے بڑے کو خط کی تفصیلات بتائیں، پھر مجھے اندر طلب کیا گیا، میں نے سر بمہر نامۂ گرامی جیفر کو دیا۔ اس نے مہر توڑی۔ اور خط پڑھنا شروع کیا۔ پڑھ کر خط اپنے بھائی عبد کی طرف بڑھا دیا۔ پھر جیفر نے سوال کیا۔ قریش نے ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ میں نے جواب دیا کہ قریش نے یا تو بہ طیب خاطر یا پھر مغلوب ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی۔ جیفر نے پھر پوچھا کہ ان کے ساتھ کون لوگ ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ لوگوں نے اسلام کو

برغبت پسند کیا ہے۔ اسے اپنی عقل و فہم کے ذریعہ سمجھا ہے۔ ساتھ ہی اللہ نے انھیں ہدایت دی، ورنہ لوگ تو کھلی گمراہی میں تھے۔ میرے علم میں تمھارے علاوہ اس طراف میں دوسرا کوئی نہیں ہے۔ جو اسلام میں داخل نہ ہو چکا ہو۔ اگر تم اسلام نہ لائے تو اسلامی لشکر کے گھوڑے تمکو روندڈالیں گے اور تمھاری سرسبز چراگاہیں تباہ کر ڈالیں گے۔ اسلام قبول کر لو تو ہر طرح امن میں رہو گے، اپنے ملک پر تم ہی عامل رہو گے۔ تم پر لشکر کشی بھی نہ ہو گی۔ جیفر نے جواب میں کہا کہ آج مجھے سوچنے کا موقع دو کل پھر ملنا۔ دوسرے دن پھر حضرت عمروؓ بن العاص تشریف لے گئے۔ لیکن جیفر نے حاضری کی اجازت نہیں دی۔ آپ عبد کے پاس پہونچے اس نے بڑے بھائی کے پاس پہونچا دیا۔ جیفر نے جواب دیا کہ میں نے مسئلہ پر اچھی طرح غور کر لیا ہے۔ اور اب سن لو کہ اگر میرے آدمیوں میں سے ایک پر بھی تم کو غلبہ حاصل ہو جائے۔ تو میں خود کو عرب کا کمزور ترین انسان تصور کروں گا،

تمھارے نبی کے گھوڑے۔ میری سرزمیں تک کبھی نہیں پہونچ سکتے اور اگر ایسا ہوا بھی تو ایسا معرکہ ہو گا کہ اس سے پہلے اُن لوگوں نے ایسا معرکہ نہ دیکھا ہو گا۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے بات آگے بڑھانی مناسب نہ سمجھی اور دوسرے دن واپسی کا اعلان کر دیا۔ جب ان لوگوں کو ان کی واپسی کا یقین ہو چلا تو عبد نے ان کو الگ لے جا کر سمجھایا کہ ہم لوگ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنپر تمھارے نبی نے غلبہ پالیا ہے۔ کیونکہ ابتک یہی ہوا ہے کہ جس کے پاس انھوں نے قاصد بھیجا اس نے ان کی بات مان لی (لیکن شاید یہ سب سیاست تھی۔ کیونکہ جب ان لوگوں نے حالات کے رخ کا اندازہ لگا لیا تو) دوسرے دن دونوں بھائیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ دوسرے ہم قوم بھی ان کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت عمروؓ بن العاص انہی کے ساتھ مقیم رہے۔ یہاں تک کہ ۱۱ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی اطلاع آئی۔

جیفر کے اسلام کے بارے میں حضرت عمروؓ بن العاص فرماتے ہیں "جیفر اور عبد نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور زکوۃ وصول کرنے کا اختیار مجھے سونپ دیا تھا۔ ان کے درمیان فیصلے میں ہی کرتا تھا۔ وہ دونوں میرے بہترین معاون و مددگار بنے رہے"

ہوذہ بن علی حاکم یمامہ کے نام نامۂ مبارک | مضمون:۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمد رسول اللہ کی طرف سے ہوذہ بن علی کے نام سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت کا راستہ اختیار کیا۔ جان لو کہ میرا لایا ہوا دین وہاں تک پہونچکر رہے گا۔ جہاں تک اونٹ اور گھوڑے پہونچ سکتے ہیں۔ اسلام قبول کر لو تو سلامتی پاؤ گے اور تمھارا ملک تمھارے پاس رہے گا۔

محمد رسول الله

سفیر کا تعارف | حضرت سلیطؓ بن عمرو۔ عامر بن لوئی قریش کے قبیلے سے ہیں۔ ان کے دو بھائی سکران و سہیل تھے۔ ان کا شمار مہاجرین اولین میں ہوتا ہے۔ حبشہ کی ہجرت میں شریک رہے۔ پھر مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی۔ جنگ بدر میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سفارت کے لیے ان کو منتخب فرمایا۔ کیونکہ یہ پہلے سے وہاں آیا جایا کرتے تھے۔ اور حجاز کی سرزمین سے اچھی طرح واقف تھے۔ روایت ہے کہ جنگِ یمامہ میں ۱۲ھ میں شہید ہوئے۔

سفارت کی تفصیل | سربہ مہر نامۂ مبارک لے کر حضرت سلیطؓ بن عمرو ہوذہ کے پاس پہونچے، اُس نے نامۂ مبارک پڑھایا۔ اور خود توجہ سے سنتا رہا۔ قاصد کا نہایت پرتپاک خیر مقدم بھی کیا۔ انھیں خلعت بھی عطا کیا۔ سہیلی نے ہوذہ اور سلیط کی حسب ذیل گفتگو نقل کی ہے، سلیط نے کہا "اے ہوذہ تم ایک بڑی سلطنت کے سردار بنائے گئے ہو اور تم کو معلوم ہے کہ

بہت سے نفوس جہنم میں ہیں۔ سردار دراصل وہ ہے۔ جو ایمان کی وجہ سے جہنم کی آگ سے
بچا لیا جائے۔ اُس نے تقویٰ اور پرہیزگاری سے اپنا زادِ سفر تیار کیا ہو۔ ایسے لوگ تمہاری
نظر کے سامنے ہیں۔ جنھوں نے سعادت حاصل کی ہے۔ اس لیے تم میری نصیحت ٹھکرا کر بدبختی
نہ خریدو۔ میں شریعت کی طرف سے تم کو بہترین کام کا حکم کرتا ہوں اور بدترین کام سے روکتا ہوں،
یعنی اللہ کی عبادت کی دعوت دیتا ہوں اور شیطان کی اطاعت سے منع کرتا ہوں۔ اللہ کی
عبادت میں جنت ہے۔ اور شیطان کی اطاعت میں جہنم۔ اگر تم میری نصیحت مان لوگے
تو تمھارے لیے۔ ہر وہ چیز ہے۔ جس کی تم توقع کرتے ہو۔ اعراض کروگے۔ تو ہمارے تمھارے
درمیان جنگ ہوگی۔

ہوذہ کا جواب | ہوذہ بن علی قبیلہ بنی حنیفہ کا مشہور شاعر اور خطیب تھا۔ قوم میں اس کا مرتبہ
بہت بلند تھا۔ اسلام لانے کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ اس کی صلاحیت اور شہرت
وغیرہ کو محدود کردیگا۔ وہ خود کہتا ہے۔

"میں اپنے دین کو سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ کیونکہ میں اپنی قوم کا سردار تھا۔ پس
اگر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتا تو پھر میری سرداری کہاں باقی رہتی" اپنی گفتگو میں
وہ اسی طرح کی باتیں کرتا تھا۔ اور اسی روشنی میں اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
جواب بھی دیا۔ جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ کی دعوت اسلام بہت ہی عمدہ ہے۔ لیکن میں
اپنی قوم کا شاعر اور خطیب ہوں۔ اہل عرب میں میرا ایک خاص مرتبہ ہے۔ وہ لوگ میرے
مرتبے سے ڈرتے ہیں۔ اس لیے آپ ایسا کریں کہ اپنے مشن میں سے کچھ حصہ میرے لیے بھی مخصوص
کردیں، تو میں آپ کی اطاعت کرونگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا مقصد
سمجھ لیا۔ اور فرمایا کہ اگر وہ ایک انگشت زمین بھی اس طرح مجھ سے طلب کرتا تو میں نہ دیتا۔

وہ خود ہلاک ہوگا۔ اور اس کی سلطنت بھی تباہ و برباد ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر خطوط | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف عنوان کے
متعدد خطوط جزیرہ نمائے عرب کے مختلف مقامات کو ارسال فرمائے۔ ان خطوط کو اجلۂ
صحابہ جن کی مجموعی تعداد پچاس سے متجاوز ہے۔ قاصد کی حیثیت سے لے کر گئے۔ ان رسائل
شریفہ کو پانچ ابواب کے تحت تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ غیر مسلمین کو اسلام کی دعوت کے سلسلے میں۔

۲۔ امور دین کی تشریح کے سلسلے میں۔

۳۔ سیاسی خطوط جو عموماً عہد نامے اور کسی کو پناہ دینے کے سلسلے میں ہیں۔

۴۔ دوسرے شہروں میں مقرر اسلامی حکام و عمال کے نام مثلاً خالد بن ولید
کے نام۔ اس طرح کے رسائل میں ضروری سوالات و استفسار کے جوابات عطا ہوئے
ہیں۔ یا پھر جزیہ و خراج وغیرہ کی تفصیل ہے۔

۵۔ عام خطوط۔ اس میں وہ رسائل آئے ہیں جو کسی کو عطیہ وغیرہ کے بعد بطور
سند یا وثیقہ کے آپ نے تحریر دی ہے۔

سید قطب کا تصورِ اعجاز القرآن

از

ڈاکٹر محمد راشد، صدر شعبۂ عربی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ،

اپنی طالب علمی کے زمانہ میں سید قطب کا نام سنتا تھا۔ مصر و شام کے اخبارات و رسائل جب کبھی دستیاب ہو جاتے تو ان میں سید قطب کے کچھ مضامین بھی دیکھنے کو مل جاتے، لیکن اِن سے ان کا کوئی خاکہ ذہن میں نہیں بن پاتا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں استاذ مکرم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی حفظہ اللہ نے ممالک عربیہ کا سفر فرمایا، جن میں مصر و شام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جب وہ طویل سفر کے بعد ہندوستان واپس تشریف لائے۔ تو جدید کتابوں کا انبار بھی ان کے ساتھ تھا۔ جن میں سید قطب کی چند اہم تصانیف بھی تھیں۔ خاص طور سے التصویر الفنی فی القرآن۔ مشاهد القیامة فی القرآن۔ العدالة الاجتماعیة فی الاسلام اور کتبٌ و شخصیات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کے جن طلبہ کو عربی زبان کا شوق و ذوق ہوتا۔ ان پر استاذ محترم خاص کرم فرماتے۔ اور ایسے طلبہ کو خود بلا کر اپنے کتب خانہ کے نوادر سے واقف کراتے اور ہر طالب علم کی ذہنی و علمی صلاحیت کے مطابق اپنی ذاتی کتابیں عنایت فرماتے، اسی زمانہ میں مجھے بھی سید قطب کی کتابیں حضرت الاستاذ کے ذاتی کتب خانہ میں دیکھنے کو ملیں۔ اور اپنے شفیق استاذ و مربی کے زیر نگرانی ان کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔

عجیب اتفاق ہے کہ میرے ہم عمر دوست اور ساتھی جو اب اللہ کو پیارے ہوگئے، مولانا محمد حسنی مرحوم بھی تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم دونوں سید قطب کی کتابیں والہانہ اور عاشقانہ انداز میں پڑھتے۔ اور دونوں ان کے اسلوب و طرز نگارش کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے اور ہفتہ میں ایک دن کسی جگہ سید قطب کی کتابوں کو پڑھنے کے بعد اپنے تاثرات کے اظہار کے لیے اکٹھا ہو جاتے۔ اور زیادہ تر وہ جگہ گوئن روڈ کی مسجد ہوتی جہاں ڈاکٹر عبد العلی سابق ناظم ندوۃ العلماء کا مکان بھی تھا۔ اس طرح ہم نے آہستہ آہستہ سید قطب کی اکثر و بیشتر کتابیں اس زمانہ میں پڑھ لیں۔ دار العلوم ندوۃ العلماء کے حلقہ میں سید قطب بہت مقبول و محترم تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ مولانا سید ابو الحسن علی الندوی کو ان سے بڑا لگاؤ اور تعلق تھا۔ اور اس طرح خود سید قطب کو مولانا سے بھی عشق و محبت تھی۔ جس کا اندازہ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کے دوسرے ایڈیشن کے مقدمہ سے ہوتا ہے۔

۱۹۵۵ء میں جب مجھے بلاد عربیہ جانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ تو میری پہلی منزل دمشق تھی۔ وہاں کے قیام کے دوران میں مجھے یونیورسٹی اور کالج کے طلبہ، اساتذہ اور شام کے بڑے فضلاء و ادباء سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ یونیورسٹی میں تعلیم کے ساتھ ساتھ میں ادبی اور علمی سمیناروں اور کانفرنسوں میں پابندی سے شرکت کی کوشش کرتا، شام ہی کے دوران قیام میں مجھے وہاں کے ادیبوں اور محققوں سے براہ راست استفادہ کا موقع نصیب ہوا۔ خاص طور سے علامہ بہجت البیطار، معروف الدوالیبی، پروفیسر مصطفیٰ زرقا، پروفیسر مصطفیٰ السباعی، پروفیسر محمد المبارک اور شام کے مایۂ ناز ادیب و شاعر خلیل مردم بک۔ ڈائریکٹر دمشق اکادمی، الاستاذ علی الطنطاوی یہ وہ حضرات ہیں

جو سیاسی میدان کے علاوہ علمی میدان میں بھی بڑے سرگرم تھے۔ اور شام کے نوجوانوں
پر علمی و سیاسی دونوں حیثیتوں سے ان کا اثر تھا۔ ان حضرات کے حلقہ میں مجھے سید قطب کا نام
دوبارہ سننے کو ملا۔ اور یہ وہ زمانہ تھا۔ جب سید قطب کو حکومت مصر نے قید کر رکھا تھا۔ اور
ان کا آوازۂ شہرت مصر سے آگے بڑھ کر تمام ممالک عربیہ میں بلند ہو چکا تھا۔ شام کے دوران
قیام میں مجھے وہاں کے نوجوانوں پر سید قطب کی چھاپ بھی نظر آئی۔ علمی و ادبی حلقوں میں ان کا
نام جس عظمت و احترام سے لیا جاتا تھا۔ اس سے میرے کان آشنا ہوئے۔ چنانچہ ان کی
کتابوں کے پڑھنے کے شوق میں مزید اضافہ ہوا۔ اور اب میں نے سید قطب کی ان کتب کا بھی مطالعہ
کیا جو ہندوستان میں میسر نہ آسکی تھیں۔ اس طرح ہندوستان سے لیکر شام تک میں نے سید قطب
کی کتب کا مطالعہ کیا۔ دوران مطالعہ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ہم لوگوں کے خاندان ہی
کے ایک فرد ہیں۔ جن کا نام لینے سے فخر محسوس ہوتا اور ان کی تحریروں کو پڑھ کر محبت کی
آگ سلگ اٹھتی۔

عجیب اتفاق ہے کہ قدرت نے مجھے اس سرزمین کی طرف جانے کا موقع عطا فرمایا،
جہاں سید قطب پیدا ہوئے۔ اور پلے بڑھے تھے۔ اور وہ ہے مصر۔ اور یہ بھی عجیب اتفاق
ہے کہ مجھے جب یونیورسٹی کے کالج میں عربی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا وہ
ہے۔ کلیۃ دار العلوم جامعۃ القاہرۃ۔ سید قطب بھی اسی کالج کے ہونہار
فرزند تھے۔ جب میں نے کالج میں آنا جانا شروع کیا اور وہاں کے اساتذہ اور طلبہ سے
میرے تعلقات بڑھے۔ اور گہرے ہوئے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ سید قطب پر اس کالج کو
کتنا ناز ہے۔ اور یہاں کے طلبہ اور اساتذہ کو ان سے کس قدر عشق و محبت ہے۔ سب کی
زبان پر حسرت کے یہی کلمات تھے کہ "آہ، وہ ادیب و فنکار مشقت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

اس کی زبان بند ہے۔ اس کے ہاتھ جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ عرصۂ دراز تک اس کالج کے
علمی سمیناروں میں اور علمی مذاکروں میں زندگی و حرکت کا سبب تھا۔ جب وہ ادبی و علمی
موضوعات پر گفتگو کرتا تو دلوں کو موہ لیتا۔ اور جب کبھی قرآن کے اسرار و رموز پر بات
کرتا تو ایسا لگتا کہ علم و عرفان کے سوتے ابل رہے ہیں۔ اور قرآن مجید کے سحر سے محو ہو کر
وہ ادیبوں اور عالموں کو بھی مسحور کر دیتا۔ یہی بات مصر کے نوجوانوں نے قرآن کے اسرار
و رموز کو ایک ادیب و انشاء پرداز کی زبانی سنا۔ سید قطب قدرۃً ادیب اور شاعر تھے
لیکن اسلام اور اسلامی تاریخ پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ وہ قرآن مجید کو ایک مقدس
کتاب کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی خوبیوں سے بھی معمور اور اس کا اعلیٰ نمونہ تصور
کرتے تھے۔ وہ اس کے فن و فکر کو ایک ایسی مربوط کڑی تصور کرتے تھے۔ کہ دونوں
ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔ اور یہی ان کے نزدیک قرآن مجید کا اعجاز ہے۔
مصر کے دوران قیام میری نگاہیں انھیں ہر علمی و ادبی محفل میں تلاش کرتیں۔ جہاں،
میرے کان ان کے نام سے محظوظ تو ضرور ہوتے لیکن آنکھ کو ان کا دیدار نصیب نہیں ہوتا،
میں ان کے ساتھیوں اور دوستوں سے ان کے گھروں پر جا کر ان کے بارے میں
پوچھتا۔ اور اپنے دل کو تسکین دیتا۔

ان کے دوستوں اور ساتھیوں کے علاوہ میں نے ان کے اساتذہ کے بارے میں
بھی معلومات حاصل کئے۔ مجھے یہ پتہ چلا کہ ایک زمانہ میں وہ عباس محمود العقاد کے بہت
معتقد اور مداح تھے۔ بلکہ ان کے حلقہ کے ایک اہم رکن تھے۔ اسی ذوق و شوق کے
تحت میں عقاد کے حلقہ میں شامل ہوا۔ یہ حلقہ ہر جمعہ کو عقاد کے گھر پر منعقد ہوتا جس میں
ہر فکر و خیال کے لوگ شرکت کرتے۔ عقاد جو مصر میں اپنے علمی رکھ رکھاؤ کے لیے ضرب المثل ہیں،

ہم نے ایک شاگرد کی داستان استاد کی زبانی سننے کی بھی کوشش کی۔ عقاد اگرچہ اس زمانہ میں سید قطب کے سیاسی نظریات سے متفق نہیں تھے۔ بلکہ انھیں سید قطب کی راہ کی تبدیلی سے بڑا دکھ اور قلق تھا۔ لیکن اپنی ناراضگی کا اظہار بھی وہ اس طرح کرتے کہ جس میں محبت کی شعاعیں پھوٹتی تھیں۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی باپ اپنے بھاگے ہوئے بیٹے کی داستان بیان کر رہا ہے۔ اس زمانہ میں مجھے سید قطب کے چھوٹے بھائی محمد قطب سے بھی ملنے کا موقع ملا جنھیں اپنے بڑے بھائی پر ناز و فخر کے ساتھ ساتھ۔ غیر معمولی احترام بھی تھا۔ اپنے بھائی کو وہ اپنا استاذ اور مربی تصور کرتے تھے۔ اور بقول ان کے انہی کی محنتوں اور کاوشوں سے انھیں علمی راہ ملی۔ اور قلم پکڑنا آیا۔ اب وہ اپنے بھائی کے نقش قدم پر چل کر ممالک عربیہ میں علمی و ادبی میدان میں جگہ حاصل کر چکے ہیں۔ محمد قطب نے مجھے اپنی قیام گاہ حلوان آنے کی دعوت دی جو سید قطب کی بھی قیام گاہ تھی۔ میری آنکھیں جس طرح سید قطب کو دیکھنے کے لیے بیتاب تھیں۔ اسی طرح ان کی قیام گاہ کے دیدار کی بھی متمنی تھیں۔ حلوان میں سید قطب کی قیام گاہ کے ساتھ ہی ان کا علمی ماحول بھی دیکھنے میں آیا۔ ان کے چھوٹے بھائی محمد قطب اور دونوں بہنیں اسی ماحول کی پروردہ تھیں۔ ان کا ذاتی کتب خانہ دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ اس مرد مجاہد کو علم سے کتنا لگاؤ اور عشق ہے۔ کتاب اور قلم ہی اس کی دنیا ہے۔ زندگی کی تمام لذتوں اور مسرتوں سے بے نیاز ہو کر اس نے سادگی اور جفاکشی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں پیش آنے والے پُر آشوب حالات کا اسے الہام ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ تجرد کی زندگی بسر کرنے پر قانع تھا۔ اور علم و ادب اور سیاست کے میدان میں بے لوث اور بے خوف ہو کر اپنے نظریات و خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

سید قطب کا علمی و ادبی ماحول

سید قطب اور اخوان المسلمین لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کے ساتھ دوسرے

کا نام بھی سامنے آجاتا ہے۔ دراصل وہ اس تحریک کے روح رواں تھے۔ لیکن یہاں اس سے ان کے تعلق پر بحث کرنے کے بجائے ہم ان کو ایک کامیاب انشاپرداز اور مصنف کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

سید قطب کی اٹھان مصر میں ایک ادیب و ناقد کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ وہ قاہرہ یونیورسٹی کے کلیۃ دار العلوم کے فاضل تھے۔ انھوں نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا اس وقت مصر ادبی مکاتب فکر میں بٹا ہوا تھا۔ جو اس وقت کی ممتاز شخصیتوں کی بنا پر وجود میں آئے تھے مصطفےٰ صادق الرافعی، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، عبد القادر المازنی، عباس محمود العقاد۔ ڈاکٹر محمد حسین ہیکل اور احمد امین کا اسلوب صرف مصر میں ہی نہیں۔ بلکہ تمام عرب ممالک کے نوجوانوں کے لیے نمونہ تصور کیا جاتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا خاص اسٹائل اپنے مزاج، ذہن اور صلاحیت کی بنا پر وجود میں آیا تھا۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جو بڑی خاموشی سے اپنا علمی و ادبی کام کرتے رہے۔ اور ان میں ایسے بھی ہیں۔ جن کا فکر و فن ادبی و تنقیدی معرکہ آرائی میں نکھرا، اُن میں مصطفےٰ صادق الرافعی۔ عباس محمود العقاد۔ طٰہٰ حسین اور عبد القادر المازنی قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی معرکہ آرائی سے اعلیٰ اور معیاری تنقید وجود میں آئی۔ ان معرکوں میں جس نے بہت سے محاذ کھول رکھے تھے۔ وہ عباس محمود العقاد ہیں جو اپنی غیر معمولی ذہانت اور ادبی مہارت میں مشہور اور اپنے صبر و استقامت میں ضرب المثل تھے۔ وہ ایک کامیاب صاحب طرز ادیب تھے۔ اور شعر و شاعری میں شوقی و حافظ کو نیچا دکھانے کے علاوہ مصر کے ادباء سے نثر نگاری ہی کی طرح شعر و شاعری میں بھی اپنی امامت و برتری تسلیم کرانا چاہتے تھے۔ اس لیے ان کو ہر محاذ پر ثابت قدم رہنا تھا۔ مصالحت یا جھکنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔

سید قطب قاہرہ یونیورسٹی کے کلیہ دار العلوم کے فاضل تھے۔ اس کالج میں زبان و ادب کے ساتھ ساتھ علوم اسلامی خاص طور سے علوم قرآن، علوم حدیث اور تاریخ اسلام پر کافی زور دیا جاتا تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو سید قطب کے لیے مستقبل میں ایک ادیب اور فکر اسلامی کا علمبردار بننے کے لیے پوری طرح زمین ہموار ہو رہی تھی۔ سید قطب کی علمی و ادبی سرگرمیوں کو ۲ دو حصوں یا دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) عباس محمود العقاد کی رفاقت کا زمانہ (۲) اخوان المسلمین کی تحریک سے وابستگی کا دور

پہلے دور میں انھوں نے قلم پکڑنے کے علاوہ ادب و ثقافت کے مختلف دھاروں سے واقفیت حاصل کی جس کے نتیجہ میں ان کے ادبی و تنقیدی ذوق میں جلا اور پختگی پیدا ہوئی۔ اس زمانہ کے ان کے مضامین و مقالات میں ادیبانہ شان تھی۔ اور ساتھ ہی ان کے اندر شاعرانہ جذبات بھی آہستہ آہستہ ابھر رہے تھے۔ اس طرح ان کے علمی و ادبی سفر کا آغاز بڑا دلکش تھا۔ اور طویل سفر کے لیے جو ساز و سامان درکار ہوتے ہیں وہ بھی ان کے پاس موجود تھے اس لیے وہ بڑے اعتماد و وثوق کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ سید قطب کو اپنے علمی و ادبی سفر کے دوران بڑی بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن وہ عزم و ثبات کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ ابتدائی مرحلہ میں وہ زیادہ تر ادبی و تنقیدی مضامین لکھتے رہے۔ جن میں عقاد کی روح کار فرما ہوتی تھی تاہم کبھی کبھی ان کے قلم میں شوخی کی جھلک بھی آجاتی تھی۔ رفتہ رفتہ مصر کے ادبی حلقوں میں ان کا وزن تسلیم کیا جانے لگا۔ حالانکہ اس زمانہ میں کسی کا چراغ آسانی سے نہیں جل سکتا تھا۔ اسی لیے۔ ابتدائی مرحلہ میں انھوں نے کسی تصنیفی عمل کا نقشہ نہیں بنایا۔ جسکی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ وہ کسی نئے اور انوکھے موضوع کا انتخاب کرنا چاہتے ہوں گے۔ اور وہ قرآن کا ادب و فن کی حیثیت سے مطالعہ تھا۔ یہ موضوع جس قدر

دلچسپ ہے، اسی قدر دشوار بھی ہے۔ اس لئے اس میدان میں قدم رکھنے والے کے لیے دو باتیں بنیادی اور لازمی ہیں (۱) اسلامی علوم کا گہرا مطالعہ (۲) ادبی و تنقیدی ذوق کا غیر معمولی ملکہ۔

قرآن مجید کا اعجاز

تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید خدا کا نہایت فائق و برتر کلام ہے۔ اس لئے کسی مخلوق کے کلام سے اس کے موازنہ کی مثال ویسے ہی ہے، جیسے اصل اور حقیقی انسان کا موازنہ کسی مصنوعی یا مصور انسان سے کیا جائے۔ یا چمن میں کھلے ہوئے پھولوں کا مقابلہ رنگین کاغذ یا پلاسٹک کے بنائے ہوئے پھولوں سے کیا جائے۔

لیکن یہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کا عقیدہ تو اسلام قبول کرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے۔ کہ ایمان و ایقان کے بعد صورت حال بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔۔ میری حقیر رائے میں ایسے سوالوں کا پیدا ہونا قدرتاً ضروری ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اس طرح کے سوالات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ تاریخ اسلام کے طالب علم کو معلوم ہے کہ مکہ کی زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مصائب کا طوفان۔ قرآن مجید کے نزول کے بعد آیا۔ کیونکہ قریش مکہ کو اگر ایک طرف اپنی روایتی سیادت و قیادت پر ناز تھا تو دوسری طرف انھیں جزیرہ عرب میں عربی زبان و بیان کی امامت بھی حاصل تھی۔ اسی طرح انھیں دو اہم خطرے لاحق ہو۔ ایک تو مذہبی قیادت کے خاتمہ کا اور دوسرے قرآن کی عظمت کے سامنے ان کی زبان و بیان کے جھنڈے کے سرنگوں ہونے کا۔ چنانچہ اس احساس اور خطرہ کے تحت ان کی زبان سے نکلا

إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ، إِنْ هٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (مدثر ۲۴-۲۵)

یہ تو منقول جادو ہے، یہ تو آدمی کا کلام ہے۔

اور کہیں یہ کہا:-

لَا تَسْمَعُوْا لِھٰذَا الْقُرْاٰنِ
وَالْغَوْا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ

تم لوگ اس قرآن کو نہ سنو اور اس پر
شور مچاؤ تاکہ تم غالب رہو۔

(حٰم السجدہ - ۲۶)

ان دونوں آیتوں سے کفار مکہ کے احساس کمتری۔ اور احساس شکستگی دونوں کا پتہ چلتا ہے۔ اگر کسی سرپھرے نے اپنی حماقت یا جہالت کی بنا پر قرآن کو چیلنج کرنے کی بات سوچی یا اس کے فکر وفن کے مقابلہ میں خود کو پیش کرنا چاہا تو خدا کی طرف سے فوراً تنبیہ آئی کہ

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ
عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا
الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ
وَلَوْ کَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ
ظَھِیْرًا (بنی اسرائیل - ۱۰)

کہہ دو کہ اگر انسان اور جن اس بات
پر مجتمع ہوں کہ اس قرآن جیسا بنالائیں
تو اس جیسا نہ لاسکیں گے اگرچہ وہ ایک
دوسرے کے مددگار ہوں۔

اور کہیں :-

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰہُ قُلْ فَاْتُوْا
بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِہٖ مُفْتَرَیٰتٍ
- (ھود - ۱۳)

کیا وہ کہتے ہیں کہ اس (پیغمبر) نے اسکو
خود گھڑ لیا ہے کہو تم اس جیسی دس
سورتیں گھڑ کر لاؤ!

اور کہیں :-

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰہُ قُلْ فَاْتُوْا
بِسُوْرَۃٍ مِّثْلِہٖ وَادْعُوْا مَنِ

کیا وہ کہتے ہیں کہ اس کو اس شخص نے
گھڑ لیا ہے۔ کہو اگر تم سچے ہو تو اس

اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ

اس جیسی ایک سورہ ہی بنا کر لاؤ
اور اللہ کے سوا جن کو تم بلا سکتے ہو بلالو،

(یونس : ۳۸)

اس طرح قرآن نے مختلف موقعوں پر عربوں کو، جنھیں اپنی زبان اور اپنی بلاغت وفصاحت پر فخر واعتماد تھا۔ اس طرح کے الفاظ سے چیلنج کیا۔ مگر وہ اس کے سامنے ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ٹک سکے۔ اور عمر بھر عاجز ودرماندہ رہے۔

یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ قرآن مجید دفعۃً نہیں نازل ہوا۔ بلکہ تیئیس ۲۳ سال کے عرصے میں وقفہ وقفہ سے اس کا نزول مکمل ہوا۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئیس سالہ زندگی اور اسلامی تاریخ کا اتار چڑھاؤ اس میں پوری طرح دکھائی دیتا ہے۔ اس کے اندر انسان کی تعلیم وتربیت اور ذہن سازی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کو پڑھ کر . . . خدا کی قدرت پوری طرح نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن جستہ نازل ہوا۔ کبھی چند آیتیں ہی نازل ہوئیں۔ اور سورتوں کی تکمیل بھی بعد میں ہوتی۔ لیکن روز اول سے آخری آیت نازل ہونے تک قرآن کا یہ چیلنج بدستور باقی رہا۔ اس چیلنج کو بعد میں اعجاز القرآن سے تعبیر کیا گیا۔

قرآن مجید کی تحدی کی نوعیت | قرآن مجید کا چیلنج کس بنیاد پر تھا؟ ہر زمانہ میں مختلف لوگوں نے اپنی فکر وعقیدہ اور اپنے ماحول وحالات کے مطابق اس کی وضاحت کی ہے۔ اس طرح قرآنی اعجاز کے متعلق جو باتیں کہی گئیں یا لکھی گئیں وہ یقیناً حقیقت وصداقت پر مبنی ہیں۔ ذیل میں قرآن مجید کی کچھ آیتیں پیش کی جاتی ہیں۔ اس نے کہیں انسانیت کی اعلیٰ تعلیم ان لفظوں میں دی

ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ

وہی (اللہ) تو ہے جس نے امیوں میں

رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ
آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن
قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۔

(جمعہ ۔ ۲)

انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کے سامنے اسکی آیتیں پڑھتا ہے۔ اور انکو پاک کرتا ہے۔ اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

دوسری جگہ ہے:۔

الٓمٓ ۔ ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ
فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (بقرہ ۔ ۱، ۲)

الم، اس کتاب میں کچھ شک نہیں یہ اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ہدایت ہے۔

ایک جگہ فرمایا:۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ
وَفِي أَنفُسِهِمْ (حم السجدہ ۔ ۵۳)

ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود انکی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے۔

ایک موقع پر فرمایا:۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ
اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ
يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا
وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ ۔
وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ
هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ

بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) ہم اکو یاد کرتے اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے۔ (اور کہتے ہیں) اے پروردگار تو نے

فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

(آل عمران ۔ ۱۹۰ ۔ ۱۹۱)

اس کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا، تو پاک ہے تو قیامت کے دن ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو!

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:۔

خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ
أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا
وَجَعَلَ بَيْنَكُم ...
مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي
ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ
يَتَفَكَّرُونَ ۔ (روم ۔ ۲۱)

اس نے تمھارے لیئے تمھاری ہی جنس کی عورتیں پیدا کیں تاکہ تم ان کی طرف مائل ہوکر آرام حاصل کرو۔ اور تم میں محبت اور مہربانی پیدا کردی۔ جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لیے ان باتوں میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔

وہ کبھی عرب کے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ
إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ
بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم
بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ
عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ
فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ۔

(آل عمران ۔ ۱۰۳)

اور اللہ کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ تو اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہوگئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے تو خدا نے تم کو اس سے بچالیا۔

اس طرح قرآن مجید کا اگر تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔ تو اس میں ہر فکر اور ہر خیال کے

لوگوں کے لیے مواد موجود ہیں۔ جن سے وہ بڑی آسانی سے قرآن مجید کے اعجاز کا ثبوت فراہم کر سکتے ہیں۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے جب عربوں کو مسحور کیا تو اس وقت ان کی بڑی اکثریت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمن اور قرآن پاک کی مخالف تھی۔ اس کے باوجود بھی اگر کہیں قرآن مجید کی کچھ آیات ان کے کانوں میں پڑ جائیں تو وہ بے چین و بیقرار ہو جاتے، اور ان کے رگ و ریشہ میں ایک کرنٹ سا دوڑ جاتا۔ اس لمحہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی ان کی راہ میں حائل نہ ہوتی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیتے اور مسرت و طرب کے عالم میں قرآن مجید کی ان آیات کو پڑھتے، جھومتے۔ اور وہ لوگ جو اپنی بیوی اور بچوں کو قرآن مجید سے دور رکھنا چاہتے تھے خود اس کے سحر کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ اور قرآن مجید باد نسیم کی طرح ان کے ذہنوں اور دماغوں کو ترو تازہ کرتا۔ اور دلوں کی گہرائیوں میں اترتا رہا۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی "سَاحِرٌ مَجْنُوْنٌ" کہا۔ اور کبھی سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا سے تعبیر کیا۔ عربوں نے قرآن مجید کو سحر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر کا خطاب قرآن مجید کی بے مثال بلاغت کی وجہ سے دیا تھا۔ کیونکہ انھیں خوب معلوم تھا کہ سحر کا عمل بالکل عارضی ہوتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کا سحر بالکل مختلف تھا۔ اس کا اثر دلوں پر اس طرح ہوتا کہ ان کی زندگی کی کایا پلٹ ہو جاتی اور ان کا ظاہر و باطن اس حد تک بدل جاتا کہ دیکھنے والے بھی حیران رہ جاتے اور وہ قرآن مجید کے پڑھنے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں وہ لطف و لذت محسوس کرتے جس نے دنیا کی تمام لذتوں اور دلچسپیوں سے انھیں غافل کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے مالوفات و مرغوبات اور زندگی کی رنگینیوں اور رعنائیوں کو خیرباد کہہ کر سادگی اور جفاکشی کے عادی ہو گئے تھے، اسلام اور قرآن مجید سے اس والہانہ

تعلق کے بعد بھی اگر اتفاقاً ان سے کبھی اسلام کے احکام کی طرف سے کوئی غفلت ہو جاتی یا ان پر عمل کرنے میں وہ تساہل کو راہ دیتے تو بارگاہ خداوندی میں معتوب قرار پاتے۔ مندرجہ ذیل آیتیں اسی قسم کے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

قُلْ اِنْ كَانَ آبَاۤؤُكُمْ وَاَبْنَاۤؤُكُمْ	کہدو کہ اگر تمھارے باپ اور بیٹے
وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ	اور بھائی اور عورتیں۔ اور خاندان کے
وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ	آدمی اور مال جو تم کماتے ہو۔ اور تجارت
تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ	جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور
تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ	مکانات جن کو پسند کرتے ہو خدا اور
مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ	اس کے رسول سے اور خدا کی راہ
فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا	میں جہاد کرنے سے تمھیں زیادہ عزیز
حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ۔	ہوں تو ٹھہرے رہو یہاں تک کہ خدا
(توبہ - ۲۴)	اپنا حکم (یعنی عذاب) بھیجے۔

ان آیات کے مخاطب کون تھے؟ ظاہر ہے وہ عرب تھے جو کل تک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف اور معاند تھے۔ مگر اب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثار ہو گئے تھے۔ اور ان کا سینہ قرآن مجید کے نور سے روشن اور معمور تھا۔ اس کے باوجود بھی ان کی تھوڑی سی کوتاہی پر یہ عتاب نازل ہوا۔ اگر قرآن مجید کا سحر، سحر سامری ہوتا تو وہ بڑی آسانی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا دامن چھڑاتے اور بڑے مزہ سے اپنے ماضی کے عیش و عشرت کی زندگی کی طرف لوٹ جاتے۔ لیکن اس کا تو عالم ہی عجیب تھا۔ کہ اس عتاب پر انھیں جس کرب و اضطراب سے دو چار ہونا پڑا اس کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے۔ جس نے ان کی تاریخ پڑھی ہے۔

عربوں پر قرآن مجید کے اس غیر معمولی اثر کی تعبیر مختلف طریقوں سے کی گئی ہے۔ اور در اصل یہی اثر اس کا اعجاز ہے۔

سید قطب اور قرآنی اعجاز کی وضاحت

سید قطب نے بھی قرآن مجید کے اس اثر کو اپنے ذوق و وجدان کے مطابق ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ عرب ہیں عربی زبان اور ادب پر انھیں غیر معمولی ملکہ حاصل ہے۔ بعثت نبوی کے ماحول پر ان کی گہری نظر ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قرآن مجید کے گرویدہ ہیں اس لیے اس کے اثر اور سحر کو وہ خود محسوس کرتے ہیں، وہ قرآن مجید سے اپنے تاثر کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میں ابھی چھوٹا بچہ تھا۔ کہ قرآن مجید پڑھنے لگا۔ مگر اس کے معانی و مطالب تک رسائی میرے لیے ممکن نہ تھی۔ اور نہ ہی اس کے بلند اور پاکیزہ مقاصد کا احاطہ میری فہم ناقص کر سکتی تھی، تاہم میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اور اپنے اندر قرآن مجید پڑھتے وقت عجیب کیفیت محسوس کرتا۔ میرا سیدھا سادہ دماغ اس میں بیان کئے گئے بعض خیالات کو مجسم صورت میں میرے سامنے پیش کرتا۔ اور یہ تصویریں گو سادہ اور بے نقش و نگار ہوتیں مگر اپنے اندر عجب ذوق و شوق اور لذت محسوس کرتا۔ طویل عرصہ تک یہ کیفیت جاری رہی۔ اور میں ان تصویروں سے محظوظ اور لطف اندوز ہوتا رہا۔ ان سادہ تصویروں میں سے جو اس وقت میرے ذہن میں مرتسم ہوا کرتی تھیں۔ ایک وہ تصویر ہے۔ جو اس آیت کی تلاوت کرتے وقت میری نگاہوں کے سامنے آجاتی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ	اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں۔
اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ	جو کنارے پر (کھڑے ہو کر) خدا کی
خَيْرُ نِ اطْمَاَنَّ بِهٖ	عبادت کرتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی

وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ	(دنیاوی) فائدہ پہنچے تو اس کے
انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا	سبب مطمئن ہو جائیں اور اگر کوئی
وَالْاٰخِرَةَ	آفت پڑے تو منھ کے بل لوٹ جائیں
(حج، ۱۱)	(یعنی پھر کافر ہو جائیں) انھوں نے
	دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی

اس خیالی تصویر کو اگر میں کسی کے سامنے پیش کروں تو وہ ہنس دے گا۔ مگر یہ تصویر یوں نگاہ تصور کے سامنے ابھری کہ میں ان دنوں ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ اور گاؤں کے قریب ہی وادی کا ایک ٹیلہ تھا۔ اسے دیکھ کر میرے تصور میں یہ بات آئی کہ ایک شخص ہے جو اس ٹیلے کی چوٹی پر کھڑا نماز پڑھ رہا ہے۔ لیکن وہ پورے طور پر کھڑے ہونے پر قادر نہیں اس طرح کانپ رہا ہے۔ گویا گرا ہی چاہتا ہے۔ اور میں اس کے سامنے کھڑا بڑے ذوق و شوق اور وجد و سرور کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں۔ اور عجیب کیفیت نشاط محسوس کرتا ہوں۔

اس طرح جو تصویریں ان دونوں مجسم ہو کر میرے سامنے آئیں۔ ان میں سے ایک وہ تصویر ہے، جو اس آیت کو پڑھتے ہی میرے سامنے آجاتی۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْ	اور ان کو اس شخص کا حال پڑھکر
اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا	سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں
فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ	عطا فرمائیں تو اس نے ان کو
مِنَ الْغٰوِيْنَ، وَلَوْ شِئْنَا	اتار دیا، پھر شیطان اس کے پیچھے
لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ	لگا تو وہ گمراہوں میں ہو گیا۔ اور

اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ۔

(اعراف - ۱۷۵)

اور اگر ہم چاہتے۔ تو ان آیتوں سے اس کو بلند کر دیتے۔ مگر وہ تو پستی کی طرف مائل ہو گیا۔ اور اپنی خواہش کے پیچھے چل پڑا۔ تو اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اگر اس پر بوجھ لادو تو زبان نکالے رہے اور یونہی چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے۔

میں اس آیت کے معنی اور مطلب کو تو نہ سمجھتا۔ مگر اس کے پڑھتے ہی ایک تصویر میرے چشم تصور کے سامنے آموجود ہوتی۔ یعنی میں دیکھتا کہ ایک شخص منہ کھولے زبان نکالے میرے سامنے کھڑا برابر ہانپتا جا رہا ہے۔ میں اس کے سامنے کھڑا ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ لیکن میں نہ سمجھ سکا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں اس سے قریب جانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح کی مختلف صورتیں میرے ناقص ذہن میں منقش ہوتی چلی جاتی تھیں۔ اور میں ان میں غور و فکر سے بہت لطف اندوز ہوتا تھا۔ ان ہی کی وجہ سے مجھ میں ذوق تلاوت پیدا ہوا۔ اور تلاوت کے وقت انہی تصویروں کو تلاش کرتا تھا۔

بچپن کے ایام گذرنے کے بعد جب میں نے تعلیمی اداروں میں قدم رکھا۔ اور تحصیل علم کا آغاز کیا تو کتب تفسیر میری نظر سے گذریں اور میں نے اساتذہ سے تفسیر قرآن کا درس لیا لیکن وہ شیریں اور حسین و جمیل قرآن مجید جس کی تلاوت میں بچپن میں کیا کرتا تھا۔ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ دا حسرتاہ، مجھے خیال ہوا کہ اس طرح میرے لیے قرآن مجید دو ہیں، ایک بچپن کا شیریں، سہل، ذوق انگیز اور شوق افزا قرآن مجید اور دوسرا عالم شباب کا مشکل، پیچیدہ، اور بظاہر غیر مربوط

غیر مربوط غالباً یہ تاثرات تفسیر کے فرسودہ اور مقلدانہ طرز و انداز کا کرشمہ تھے۔ اس خیال کی وجہ سے میرے اندر ایک نیا رجحان پیدا ہوا اور میں نے کتب تفسیر سے صرف نظر کر کے قرآن مجید کو خود اس کی مدد سے پڑھنا شروع کیا، حیرت کی بات ہے۔ کہ مجھے پھر میرا کھویا ہوا حسین اور پیارا قرآن مجید مل گیا۔ وہی شوق انگیز لذیذ تصویریں میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگیں۔ صرف اتنا فرق تھا کہ ان تصویروں میں وہ پہلی سی سادگی باقی نہ رہی تھی کیونکہ میرے فہم و ادراک کے زاویے تبدیل ہو چکے تھے۔ اور اب میں ان تصویروں کے اغراض و مقاصد بھی سمجھنے لگا تھا۔ اور جانتا تھا کہ یہ مثالیں ہیں جو فہم قرآن کے لیے بیان کی گئی ہیں۔ ان میں کوئی منظر کشی نہیں کی گئی ہے۔ تاہم تصویروں کی سحر طرازی کا وہی عالم تھا۔ اور ان میں ہنوز وہی جاذبیت اور اثر آفرینی باقی تھی۔ الحمد للہ میں قرآن کو پھر سے تلاش کر لیا۔[1]

دوسری جگہ وہ اس سے بھی زیادہ وضاحت اور تفصیل سے قرآن مجید کے اعجاز اور اس کی سحر آفرینی پر گفتگو کرتے ہوئے۔ لکھتے ہیں۔

”اب سوال یہ ہے کہ قرآن مجید نے عربوں کو کس طرح مغلوب کیا۔ اور مومن و کافر اس کی سحر کاری پر کس طرح متفق ہو گئے بعض محققین جنھوں نے قرآن کریم کی خصوصیات پر قلم اٹھایا ہے۔ . . . . اس پر بحیثیت مجموعی نگاہ ڈال کر اس کا جواب دینے کی کوشش کی ہو بعض علماء نے قرآن کریم کے فنی تناسق و توافق کے علاوہ اس کے کچھ دیگر اسباب بیان کیے ہیں، جو اس کے موضوعات اور عناوین سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً یہ کہ قرآن مجید نے اپنے نزول کے مکمل ہونے کے بعد جو شریعت پیش کی ہے۔ وہ ہر زمانہ اور ہر خطہ کے لیے موزوں ہے۔

---

[1] التصویر الفنی فی القرآن - ص ۱۹-

اس کے ساتھ ہی اس نے ان واقعات سے قبل از وقت آگاہ کیا ہے۔ جو کئی برسوں کے بعد وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ مزید براں قرآن مجید علوم کونیہ پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ جو کائنات اس کی اور تخلیق کے ساتھ متعلق ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ مذکورۂ بالا خصوصیات قرآن مجید میں بحیثیت مجموعی پائی جاتی ہیں۔ اور اس لحاظ سے اس کو اور اس کے طریقۂ بحث کو برتری و فضیلت بھی حاصل ہے۔ مگر ان چھوٹی چھوٹی سورتوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا جن میں نہ تو تشریعی احکام مذکور ہیں۔ اور نہ غیبی امور کا تذکرہ ہے۔ اور نہ علوم کونیہ کا کوئی ذکر بیان ہے۔ وہ صورتیں طبعی طور پر ان تمام خصوصیات کی جامع بھی نہیں ہو سکتیں۔ جو قرآن میں بحیثیت مجموعی موجود ہیں۔ حالانکہ انہی صورتوں نے عربوں کو مسحور کر دیا تھا۔ اور یہ آغاز نبوت میں اس وقت نازل ہوئیں۔ جب کہ دین شریعت کی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان سورتوں نے عربوں کے احساسات کو ابھارا۔ اور ان سے خراج تحسین وصول کیا۔

اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ ان چھوٹی چھوٹی سورتوں نے بھی سامعین کو مسحور کیا۔ اور مومن و کافر کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اگر یہ مسلّم ہے کہ لوگوں کے مشرف بہ اسلام ہونے میں قرآنی تاثیر کو بڑا دخل ہے۔ تو اس بات کو بھی ماننا پڑے گا کہ اثر انگیزی میں ان چھوٹی چھوٹی سورتوں کا بھی بڑا حصہ ہے خواہ اس وقت اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ رہی ہو۔ اس لیے کہ اس دور میں لوگ صرف قرآن مجید سے غیر معمولی طور پر متاثر ہو کر ہی حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔ لیکن اسلام کے ظہور و غلبہ کے بعد اکثر لوگوں کے مشرف بہ اسلام ہونے کے کچھ اور عوامل و محرکات بھی تھے۔ اسلام قبول کرنے والے ہر شخص کے لیے اس کے حسب حال ایک جداگانہ عامل تھا۔ صرف قرآن مجید ہی اس کا تنہا موجب نہیں تھا۔ مگر اس کے برخلاف آغاز اسلام میں مشرف بہ اسلام ہونے کا باعث و محرک قرآن مجید اور صرف قرآن مجید تھا۔[1]

سید صاحب پھر ایک دوسرے موقع پر قرآن مجید کے سحر و اعجاز پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اب اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کہ جب شریعت کی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔ غیبی اخبار کی اطلاع بھی اس وقت تک نہیں ہوتی تھی۔ علوم کونیہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا گیا تھا۔ غرض قرآن مجید کا وہ قلیل حصہ جو دعوت اسلام کے ابتدائی دور میں نازل ہوا تھا۔ ان تمام امور و اوصاف سے خالی تھا۔ جو بعد ازاں اس کے حصہ میں آئے تھے۔ تاہم اس کے باوجود اس میں افسوں گری اور سحر طرازی کا منبع موجود تھا۔ جس سے وہ لوگ آشنا ہوئے۔ اور جس کے بارے میں انھوں نے "اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ" کے الفاظ کہے تھے۔[2]

سید قطب قرآن مجید کے اعجاز کو اس کی سحر بیانی میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :-

"ہم چاہتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے قرآن کریم کے دینی تقدس اور اسلامی دعوت کے اغراض و مقاصد سے صرف نظر کر کے۔ اور زمان و مکان کے حدود و قیود سے آگے بڑھ کر اس کے اس خالص فنی حسن و جمال کو تلاش کریں جو ایک مستقل بالذات عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جو قرآن مجید ہی کی طرح دائمی اور ابدی ہے۔ اور یہ فنی حُسن و جمال اس کو دیگر امور سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے ہی قرآن مجید کے دینی اغراض و مقاصد پورے ہو کر اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا ہے۔"[3]

۱؎ التصویر الفنی فی القرآن۔ ص ۲۸۔ ۲؎ ایضاً۔ ص ۲۹۔ ۳؎ ایضاً۔ ص ۳۵

قرآن مجید کی سحربیانی کا راز سید قطب صاحب اپنی رائے کی تائید کے سلسلہ میں مختلف صحابہ کرام
کے واقعات و احوال نقل کر کے ان کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کا سبب بتاتے ہیں۔ اس طرح انکا
نظریہ اعجاز القرآن قرآن کی سحربیانی میں پختہ ہو جاتا ہے۔ لیکن سحربیانی کا کیا راز ہے۔ اس کو
کس طرح سمجھا جائے۔ اس کی گہرائیوں میں کس طرح پہونچا جائے۔ یہ بھی ایک مسئلہ ہے۔ کسی چیز
سے متاثر ہونا الگ بات ہے۔ اور اس تاثر و احساس کو بیان کرنا الگ مسئلہ ہے۔ عام مفسرین
کے اندر اصحاب معانی و بلاغت سے مختلف ہے۔ حالانکہ دونوں کبھی ایک مرکز پر متفق ہوتے ہیں۔
لیکن دونوں کی تعبیروں اور تصویروں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ مفسرین
پر اپنے مزاج و طبیعت کے مطابق شدت سے تنقید کرتے ہوئے۔ لکھتے ہیں کہ

دوسری صدی کے بعد اکثر و بیشتر مفسرین نے قرآن مجید کے معانی و بیان کو لفظی جھگڑوں
میں ایسا الجھایا کہ قرآن مجید کو پڑھتے وقت نہ اس کی بلاغت، عظمت ظاہر ہوئی اور
نہ اس کے سحر و جمال کا ادراک ہوا بلکہ اس کے بجائے بیزاری یا اس کی فکر میں جمود
پیدا ہونے لگا۔ اور قرآنی فکر فقہی اور کلامی مسائل کے پردہ میں چھپ گئی۔

علامہ زمخشری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عام مفسرین کے مقابلہ میں وہ زیادہ ممتاز
اور اعلیٰ ہیں۔ کیونکہ انہوں نے قرآن مجید کے حسن و جمال کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش کی اگرچہ
اپنے احساسات کو واضح کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

متاخرین میں یہ ایک شخص ہے۔ جس کو کسی حد تک قرآن کے فنی حسن و جمال کا ادراک و
احساس ہوا۔ مثلاً وہ قرآنی آیت: وَلَمَّا سَكَتَ عَن مُّوسَى الْغَضَبُ۔ کی تفسیر کرتے
ہوئے لکھتا ہے:

"گویا غصہ موسیٰ علیہ السلام کو اس فعل پر آمادہ کر رہا تھا۔ جو آپ نے انجام دیا، اور

کہہ رہا تھا کہ اپنی قوم سے یوں کہئے۔ تورات کی تختیوں کو پھینک دیجئے۔ اپنے بھائی کو
بالوں سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچئے۔"

تاہم زمخشری کی یہ کوشش بھی زیادہ کامیاب نہیں، اس میں وضاحت و صراحت کی
بڑی حد تک کمی پائی جاتی ہے۔ اس آیت کی بہترین تعبیر یوں ہے۔ کہ فرض کر لیا جائے کہ غضب
ایک انسان ہے۔ جو بولتا بھی ہے۔ اور خاموش بھی ہو جاتا ہے۔ وہ حضرت موسیٰ کو ان
کاموں پر ابھارتا بھی ہے۔ اور خاموش بھی کر دیتا ہے۔ گویا اس تعبیر کا اصل حسن و جمال غضب
کو ایک انسان فرض کر لینے پر موقوف ہے۔ زمخشری کو اس کا احساس ضرور ہوا مگر وہ
کھل کر اس کی وضاحت نہ کر سکے۔ یا وضاحت تو کی مگر اپنے عصر و عہد کے مطابق اس لئے
اسے معتوب نہیں کہا جا سکتا۔

زمخشری سورہ الفاتحہ کی تفسیر میں یوں رقم طراز ہیں۔

" بندہ جب اپنے آقا و مولا کی حمد و ثنا کا آغاز کرتے ہوئے۔ بخلوص دل سے کہتا ہے۔
الحمد للہ" تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حمد و ثنا کا سزاوار صرف وہی ہے۔ اس کے
تبعاً وہ ذات باری کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ "رب العلمین" یعنی
وہ سب جہانوں کا مالک ہے، کوئی چیز بھی اس کی ملکیت اور ربوبیت کے دائرہ سے
خارج نہیں۔ پھر کہتا ہے۔ "الرحمٰن الرحیم" سب بڑی اور چھوٹی انواع اقسام
کی نعمتیں دینے والا وہی ہے۔ اس کے اس تشخص میں توجہ الی اللہ کی تحریک اور تیز ہو جاتی
ہے۔ جب ان عظیم صفات خداوندی کے آخر میں وہ کہتا ہے:

" ملک یوم الدین" روز جزا تمام امور کا مالک وہی ہوگا۔ یہاں پہونچکر
وہ تحریک اپنے عروج پر پہونچ جاتی ہے۔ اور بندہ پوری طرح اس کی جانب کھینچ جاتا ہے

پھر انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ مشکلات میں اس سے طالب امداد ہوتا۔ اور
کہتا ہے: "إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ"[1]

سورہ فاتحہ کی آیات کے مسلسل مطالعہ سے جو احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس میں فنی نظم و ترتیب
کی صورت گری ایک عمدہ کوشش ہے۔ قرآن کریم میں نظم و ارتباط پیدا کرنے کے لیے
ابتدائی دور میں جو انداز اختیار کیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک ہے۔

ایک جگہ وہ ان مفسرین کے نقطۂ نظر اور ان کے ذہن کی رسائی اور اعجاز القرآن
کے ادراک کا ذکر کرتے ہیں۔ جنھوں نے قرآن مجید کے ان مقامات کا ذکر کیا ہے۔ جن میں
زبان و بیان کے ساتھ معنوی اور لفظی ربط و تسلسل پایا جاتا ہے۔ وہ فرماتا ہے،

بعض مفسرین نے یہ کوشش کی تھی۔ کہ قرآن کریم کے جن مقامات میں اس
قسم کا نظم و نسق پایا جاتا ہے۔ ان سے آگاہ کریں۔ مگر وہ اس میں کامیاب
نہ ہو سکے۔ انھوں نے صرف ان مقامات کی نشاندہی کی جہاں آیات میں ایک
قسم کا معنوی ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔ مگر اس کے لیے وہ کوئی عام قاعدہ
وضع نہ کر سکے۔ پھر ایسا کرنے میں بھی بعض جگہ انھیں حد درجہ تکلف سے کام
لینا پڑا۔[2]

مفسرین کے تصور اعجاز القرآن کے بعد وہ علمائے بلاغت کی ذہنی کاوشوں کا ذکر
کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ،

اب بلاغت اور اعجاز القرآن پر بحث کرنے والے علماء باقی رہے۔ امید کی جاتی
تھی۔ کہ یہ اس میدان میں مفسرین سے آگے بڑھیں گے اور وہ قرآن مجید کے فنی حسن و جمال پر

---

[1] التصویر الفنی، ص ۳۹-۴۱ [2] ایضاً۔ ص ۱۴۔

داد تحقیق دینے کے اہل بھی تھے۔ مگر انھوں نے اپنے آپ کو بے کار مباحث میں الجھائے
رکھا۔ مثلاً یہ کہ بلاغت الفاظ میں پائی جاتی ہے۔ یا معانی میں؟ ان میں بعض علماء
ایسے بھی تھے۔ جن پر بلاغت کے قاعدوں کی روح چھائی ہوئی تھی۔ اور اس سے انھوں نے
قرآن مجید کے حسن و جمال کو نظر انداز کر دیا۔ یا اس سے صرف نظر کر کے تقسیم و تبویب میں
لگ گئے۔ اور بعض اوقات تو انھوں نے عنان توجہ ایسے امور کی جانب مبذول کی
جو ناقابل برداشت تھے۔

اب ذرا قرآن کریم کی حسین ترین تعبیر پر غور فرمائیے۔ ارشاد ہوا۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُجْرِمُونَ — اور تم تعجب کرو جب دیکھو کہ گنہگار
نَاكِسُو رُءُوسِهِمْ عِندَ — اپنے پروردگار کے سامنے سر جھکائے
رَبِّهِمْ (السجدہ: ۱۲) — ہوں گے۔

منکرین اسلام روز قیامت جس ذلت و رسوائی سے دوچار ہوں گے۔ یہ آیت اس کی
زندہ تصویر ہے۔ اس آئینہ کے دیکھنے سے ایسا نظر آتا ہے کہ یہ مجرم سر جھکائے کھڑے ہیں اور
کس کے سامنے کھڑے ہیں؟ اپنے رب کے سامنے۔ سامع یہ تصور کرنے لگتا ہے کہ یہ مجرم چشم
تصور ہی میں نہیں بلکہ حقیقتاً کھڑے ہیں۔ ذرا غور فرمائیے۔ اس ہولناک منظر کی تصویر کشی پر علم البلاغت
کا ایک ماہر صرف یہ بات کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔

اس طرح سید قطب نے مختلف جگہوں پر قرآن کے فن کا فنی انداز میں جائزہ لیا ہے۔
وہ اپنے جائزہ میں قدیم مفسرین اور علمائے بلاغت سے ہٹ کر اپنی راہ خود متعین کرتے ہیں
منطقی اور لفظی مباحث سے اپنا دامن پوری طرح بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ قرآن کو
زندہ اور جاوید صحیفہ صرف تصور ہی نہیں کرتے بلکہ قرار دے سامعین میں اس کے مختلف مقامات

جو شواہد پیش کرتے ہیں۔ اور اس عمل میں مبالغہ کی کہیں بھی جھلک نظر نہیں آتی۔ بلکہ سادہ زبان میں وجدانی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ قرآن پڑھنے والا اس کے ظاہری اور باطنی اعجاز کو محسوس کرے۔ اور اس پر بھی وہی کیفیت طاری ہو جائے۔ جو قرن اولی کے صحابہ کرام میں پیدا ہوتی تھی۔ وہ اس کیفیت کو بیان نہیں کر پاتے تھے۔ لیکن قرآن کی تلاوت کے وقت ان کو دیکھنے والا محسوس کرتا تھا۔ کہ وہ کسی خاص کیفیت سے دوچار ہیں۔ ان کے چہروں کے اتار چڑھاؤ اور آنکھوں کی چمک نیز رات کی تاریکیوں میں تلاوت کرنے والوں کی درد بھری آواز معلوم نہیں کتنوں کو مسحور کر دیتی تھی۔ سید قطب کا تصور اعجاز القرآن اس کی فصاحت و بلاغت، تصویر نگاری۔ اور اس طریقہ تعبیر و اسلوب میں بنیادی اور اساسی قاعدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ مشاھد القیامۃ فی القرآن کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ:

اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے قرآنی آیات کا اچھی طرح جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآنی قصص و واقعات، مناظر قیامت، انسانی امثال و نظائر اور منطق و وجدان کے ساتھ اگر نفسی حالات، ذہنی امور کی تشخیص و تجسیم اور عہد رسالت کے بعض واقعات کی تمثیل کو شامل کر لیا جائے تو کمیت و اعتبار کے تقریباً قرآن کے ۳/۴ حصہ پر مشتمل ہیں، ان سب میں تصویر نگاری کے انداز سے کام لیا گیا ہے۔ اس طریقے سے صرف وہی مقامات مستثنیٰ ہیں جہاں یا تو کوئی شرعی حکم بیان کیا گیا ہو یا جدل کے طریقہ کو استعمال کیا گیا ہے، یا بعض دوسرے مسائل جہاں کسی بات کو سیدھے سادے طریقے سے بیان کرنا ضروری ہو۔ یہی ایسے مسائل جو سادہ طریقے یا تصویر نگاری بیان کیے گئے ہیں، وہ قرآن کے ۱/۴ حصہ پر مشتمل ہیں، لہٰذا میرا یہ قول ہر طرح کی مبالغہ آمیزی سے پاک ہے کہ قرآن اسلوب و انداز میں منظر نگاری کے طریقہ کو دیگر طرق بیان کے مقابلے میں ترجیح دی گئی ہے۔[۱]

اعجاز القرآن کے نام کو سید قطب نے کچھ نہیں لکھا، لیکن انکی دونوں کتابوں مشاھد القیامۃ فی القرآن سے انکا تصور اعجاز القرآن پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے فی ظلال القرآن میں ان مقامات کی جہاں انھیں اعجاز القرآن کی تجلیات نظر آتی ہیں، اپنے خاص وجدانی انداز میں تفسیر بیان کی ہے، وہ زمخشری کی طرح صرف اعجاز القرآن کو محسوس ہی نہیں کرتے بلکہ اپنے احساسات و ادراکات کو دوسروں تک منتقل بھی کر دیتے ہیں

مکتوب پیرس

پاریس۔ یکم رمضان ۱۴۰۷ھ

مخدوم و محترم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

موقر رسالہ معارف کا شمارہ جنوری ۱۹۸۷ء ابھی ابھی آیا تو ورق گردانی سے استفادہ کیا۔ خاص کر پروفیسر عبد الرحمٰن مومن صاحب کا مضمون بہت ٹھوس ہے۔

اسی شمارے میں صفحہ ۴۰ پر درج ہوا ہے کہ: "حمید اللہ صاحب نے مجموعۃ الوثائق السیاسیہ میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ حضرت عمرو رضی بن حزم کے صاحبزادے کی ولادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے ڈیڑھ برس قبل ہوئی تھی۔ یہ بات درست نہیں، اس لیے کہ مورخین بالاتفاق یہ تحریر کرتے ہیں کہ آپ کو سنہ ھ میں نجران کا عامل بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اور بچے کی ولادت نجران میں ہی ہوئی تھی۔"

ہو گا۔ لیکن مورخین کا "بالاتفاق" تحریر کرنا۔ اس لئے صحیح نہیں کہ میں نے ابن عبد البر کی الاستیعاب کی ایک روایت یہاں نقل کی، اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔

صاحب مقالہ اگر الوثائق السیاسیہ کا پانچواں اڈیشن سامنے رکھتے تو ان کے مضمون کے لئے مزید معلومات بھی ملتیں۔ وہ کراچی کے رسالہ ہمدرد اسلامیکس جلد ۵، شمارہ ۳ ۱۹۸۲ء صفحہ ۳ تا ۲۰ اور وہاں با تصویر مضمون سے بھی ناواقف نظر آتے ہیں۔ اسی طرح الاکوع اور محمد الی کی تالیف الوثائق السیاسیہ الیمنیۃ، طبع بغداد ۱۹۷۶ء ان کے لیے مفید ہو۔

نیاز مند
محمد حمید اللہ

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر اور نئے رسالے

منہاج اجتہاد و عشر نمبر حصہ اوّل و دوم :- مرتبہ جناب سید محمد متین ہاشمی صاحب، معارف سائز

کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات اجتہاد نمبر ۳۰۴، عشر نمبر اول ۲۲۴، عشر نمبر دوم ۱۹۲

قیمت سالانہ ۱۰۰ روپیے، پتہ مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری نسبت روڈ، لاہور

یہ سہ ماہی رسالہ مرکز تحقیق دیال سنگھ لائبریری لاہور سے شائع ہوا ہے۔ جو خالص فقہی مضامین کے لیے مخصوص ہوگا۔ اور اس کا ہر شمارہ تقریباً دو سو صفحے پر مشتمل خاص نمبر کی صورت میں شائع ہوگا، ہمارے پیش نظر ۱۹۸۳ء کے تین شمارے ہیں، ان میں پہلا اجتہاد نمبر ہے۔ جو اجتہاد و تفقہ سے متعلق مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں مختلف حلقۂ فکر کے علما نے اجتہاد کے مفہوم، اہمیت اور مجتہد کے اوصاف و شرائط کے بارہ میں مضامین لکھے ہیں۔ ایک مضمون شیعی اہل قلم کا بھی فقہ جعفری کی اساس و ہئیت اور اجتہاد پر ہے پہلے مضمون میں اجتہاد کے متعلق ڈاکٹر محمد اقبال کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہے۔ ایک اور مضمون میں امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد کے طریق کار کی وضاحت کی گئی ہے۔ آخر میں اسلامی قانون میں اجتہاد کے مقام کے بارہ میں کچھ سوالات کا مختلف مسلک کے علماء نے جواب دیا ہے۔ دوسرا اور تیسرا شمارہ عشر نمبر ہے۔ اس میں عشر کے احکام قرآن و حدیث اور مختلف فقہی مکاتب فکر کی روشنی میں بیان کئے گیے ہیں۔ اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ اور

فقہ جعفری کے موقف کا بھی ذکر ہے۔ تیسرے شمارہ میں عشر کے موضوع پر ایک مجلس مذاکرہ کی روداد قلمبند کی گئی ہے، جو دیال سنگھ لائبریری ہال میں منعقد ہوئی تھی، اور جس میں مختلف طبقہ و مسلک کے علما شریک تھے، اس نمبر کا ایک خاص مضمون وفاقی شرعی عدالت ایک جدید اجتہادی ادارہ ہے اس میں پاکستان کی موجودہ حکومت کی ان کوششوں کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے، جو اسلامی فقہ و قانون کے بتدریج نفاذ کے لئے مسلسل کی جارہی ہیں۔ یہ فقہی رسالہ مفید اور اچھے مقصد سے جاری کیا گیا ہے۔ خدا اس کو پائداری عطا کرے!

غالب نامہ مومن نمبر :- مدیر اعلیٰ پروفیسر نذیر احمد، مدیران رشید حسن خان و ڈاکٹر نور الحسن انصاری و شاہد ماہلی، کتابی سائز، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۶۴

قیمت۔ ۳۰ روپیے۔ پتہ غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

غالب نامہ اردو کا ادبی و تحقیقی مجلہ اور غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کا ترجمان ہے، جو گذشتہ کئی برس سے شائع ہو رہا ہے۔ جس طرح اس کے مضامین و مشمولات بلند پایہ ہوتے ہیں، اسی طرح اس کی شکل بھی دیدہ زیب اور دلکش ہوتی ہے، فروری ۱۹۸۳ء میں انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے حکیم مومن خان مومن کے فن و شخصیت پر ایک سمینار منعقد ہوا تھا، جس میں ہندوستان کے علاوہ ایران کے بعض اصحاب علم و ادب بھی شریک ہوئے تھے۔ زیر نظر شمارہ میں سمینار کے لیے لکھے گئے۔ چودہ مضامین کو بہت قرینہ سے مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے۔ ان مقالوں میں مومن کی شاعری اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اور خوبیوں کے ساتھ کمیوں اور خامیوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، ڈاکٹر خلیق انجم نے مومن کا سوانحی خاکہ تحریر کیا ہے۔ رشید حسن خاں صاحب نے مومن کی پیچیدہ بیانی پر بحث کر کے بتایا ہے کہ ان کی معنی آفرینی نے پیچیدہ بیانی کا پیرایہ

اختیار کیا ہے۔ اور یہ رنگ ان کے یہاں ناسخ کے اثر سے پیدا ہوا، جس نے ان کی غزلوں کے بڑے حصہ کو بے مزہ اور بے کیف بنا دیا ہے، لیکن کئی مقالوں میں مومن کی عظمت و انفرادیت کا بھی ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا یہ خیال مبنی بر حقیقت اور قابل غور ہے کہ "مومن کی شاعری بڑی سخت جان ہے . . . اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ غالب کے عہد میں یہ شاعری اپنی شادابی، بانکپن اور تازگی کے ساتھ نہ صرف زندہ رہی، بلکہ اس عہد کے شاعرانہ ماحول پر حاوی بھی رہی، دوسری وجہ یہ ہے کہ میر اور غالب کے اعلیٰ ترین جمالیاتی معیار کے باوجود یہ شاعری آج بھی گفتگو کا موضوع بنتی ہے۔ کچھ ایسی باتیں ضرور ہیں جو اسے اس زمانہ میں رکھے ہوئے تھیں۔ اور آج بھی اس کی زندگی کی ضامن بنی ہوئی ہیں"۔ ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے مومن کے نقادوں کا جائزہ لیا ہے۔ اور ان کی مخالفت کے اسباب بھی بتائے ہیں۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا مقالہ متوازن اور لائق مطالعہ ہے۔ اس میں مومن کے تلامذہ پر ان کے اثرات دکھائے ہیں، اور بتایا ہے کہ بعض نے مومن کے رنگ میں کچھ نئے برگ و بار بھی پیدا کئے۔ اسلم پرویز صاحب نے غالب و مومن کا حقیقت پسندانہ تقابل کیا ہے، اسی نوعیت کا مقالہ مومن اور شیفتہ" (ڈاکٹر صلاح الدین) بھی ہے، بعض مضامین میں ان کی فارسی شاعری اور خطوط پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے، آخر میں مومن کی غزلیات کا انتخاب ہے، یہ نگارکے مومن نمبر سے ماخوذ ہے۔ "سرگرمیاں" اس رسالہ کا ایک مستقل کالم ہے، جس میں انسٹی ٹیوٹ کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر ہوتا ہے، اس شمارے میں اس کالم میں سمینار کی مکمل روداد اور بعض دوسری ادبی تقریبات کی تفصیل تحریر کی گئی ہے، یہ اچھا نمبر شائع کرکے انسٹی ٹیوٹ نے ایک مفید ادبی خدمت انجام دی ہے۔

گلدستۂ مضامین دینیہ و مجلۃ النادی	شائع کردہ جامعہ محمدیہ منصورہ، مالیگاؤں، ضلع ناسک (مہاراشٹر)، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، سائز بڑا۔

جامعہ محمدیہ کی عمر زیادہ نہیں ہے مگر اس نے مولانا مختار احمد ندوی کی سربراہی میں تھوڑی ہی [illegible] میں علمی و تعمیری

حیثیت سے نمایاں ترقی کی ہے۔ اس سال اپریل میں جامعہ کی وسیع عمارت سلطان منزل کے افتتاح اور سالانہ اجلاس کے موقع پر دینی مضامین کا یہ گلدستہ شائع کیا گیا ہے۔ جو اچھے دینی اصلاحی مضامین اور نظموں پر مشتمل ہے، جامعہ کے اساتذہ طلبہ کے علاوہ دوسرے اصحاب علم کے نئے اور پرانے مضامین بھی درج کئے گئے ہیں۔ دوسرا رسالہ جامعہ کے طلبہ کی انجمن النادی المحمدی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اور تمامتر طلبہ ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، اس میں ان کے اردو کے علاوہ عربی اور انگریزی مضامین بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ جامعہ کے دوسرے شعبہ مدرسہ عائشہ کی طالبات کا مجلۃ الحمیرا بھی اس کے ساتھ منسلک ہے، جو ان کے اردو و عربی مضامین پر مشتمل ہے۔ طلبہ و طالبات کے اس مجلہ سے جہاں ان کی اچھی علمی و تحریری صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہاں جامعہ کے دائرہ فیض و خدمت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

الفلاح :۔ مرتبہ، جناب عبد البر اثری صاحب، لمبی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۰۹، قیمت آٹھ روپیے۔ پتہ، جمعیۃ الطلبہ جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڈھ۔ یو۔ پی۔

یہ جمعیۃ الطلبہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج کا سالانہ میگزین ہے۔ جس میں بکثرت دلکش عنوانات کے تحت مفید علمی، دینی، تاریخی و سیاسی مضامین درج ہیں، آخر میں عربی و انگریزی مضامین کا حصہ بھی ہے۔ جابجا نظموں کی چاشنی بھی ہے، جامعۃ الفلاح کے طلبہ کی ذہنی و علمی استعداد بلند ہوتی ہے، اس لئے ان کے مضامین کی سطح بھی بلند ہے۔ ایک حصہ میں ملک و ملت کے بعض اکابر کے پیغام بھی دیے گئے ہیں، اس میگزین کی اشاعت پر جامعہ کے طلبہ حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔

یادگار مجلہ :۔ مرتبہ مولانا ابو العاص وحیدی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت

وطباعت اچھی صفحات ۱۱۲۔ قیمت بارہ روپے ؍۱۲ پتہ:۔ شعبۂ نشرواشاعت جامعہ سراج العلوم کنڈو بونڈیہار، گونڈہ، یو۔پی۔

جامعہ سراج العلوم کنڈو بونڈیہار ضلع گونڈہ کا قدیم و مشہور دینی ادارہ ہے، جو جمعیۃ اہلحدیث کے زیر نگرانی عرصہ سے علمی و تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے، نومبر ۸۶ء میں جامعہ نے ایک علمی مذاکرہ اور اجلاس عام کا اہتمام کیا تھا، اس میں ملک کے مختلف علاقوں کے علماء نے تقریریں کیں۔ اور مضامین پڑھے، اس موقع پر جامعہ کی گذشتہ خدمات اور اس سے وابستہ اہم شخصیتوں کے تعارف کی غرض سے یہ خاص نمبر شائع کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں تحریک اہلحدیث اور نصاب و طریقہ تعلیم کے بارہ میں بھی بہتر مضامین درج ہیں۔ نمبر سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے۔

دوماہی ندائے فضلاء :۔ مرتبہ۔ مولوی جمیل احمد نذیری و احمد الراشد مبارکپوری صاحبان، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۴۸۔ قیمت فی شمارہ پانچ روپے ؍۵۔ سالانہ چندہ ۲۵ روپے۔ پتہ:۔ منیجر دوماہی ندائے فضلاء، مبارکپور۔ اعظم گڈھ ۲۷۶۴۰۴۔

اعظم گڈھ کے مشہور صنعتی قصبہ مبارکپور کے نوجوان اور ذی حوصلہ علماء نے چند برس قبل نادیۃ الفضلاء کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے، یہ دوماہی رسالہ اس کا ترجمان ہے اس میں دینی و اصلاحی مضامین کے علاوہ نظموں کا حصہ اور استفتاء کا بھی کالم ہوتا ہے۔ یہ رسالہ عربی مدارس کے نئے فارغین کی تحریری تربیت و رہنمائی کے لیے جاری کیا گیا ہے۔

ماہنامہ نوائے دارالعلوم :۔ مرتبہ۔ جناب نثار احمد قاسمی ندوی تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۸۰، قیمت درج نہیں۔ پتہ: شعبہ نشرواشاعت دارالعلوم مئوناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱

دارالعلوم مئو کا قدیم اور بڑا دینی مدرسہ ہے، اب اس کے اساتذہ اور کارکنوں نے یہاں سے یہ ماہنامہ جاری کیا ہے، جو مفید دینی و اصلاحی مضامین پر مشتمل ہوتا ہے مضامین میں تنوع کا خیال رکھا جاتا ہے۔

مطبوعات جدیدہ

دعوۃ القرآن تفسیر سورۂ انفال تا یوسف | از جناب شمس پیرزادہ صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، از صفحات ۵۸۳ تا ۸۲۹، روپیہ ۱۰ روپے

پتہ۔ ادارہ دعوۃ القرآن ۵۹ محمد علی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳۔

ادارۂ دعوۃ القرآن بمبئی سے شائع ہونے والی تفسیر دعوۃ القرآن کے بعض اجزا کا ذکر ان صفحات میں ہوچکا ہے، زیر نظر حصہ میں سورۂ انفال تا سورۂ یوسف کا متن مع ترجمہ و تفسیر درج ہے، اس کے مصنف جناب شمس پیرزادہ کو قرآن مجید کے مطالعہ سے دلچسپی بھی ہے اور وہ تحریر و تصنیف کا اچھا سلیقہ بھی رکھتے ہیں، یہ تفسیر دعوتی مقاصد کو پیش نظر رکھکر لکھی گئی ہے۔ اور اس کا بنیادی مقصد غیر مسلموں کو قرآن مجید کی اصل دعوت و پیغام سے واقف کرانا، اور ان کے نیز جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے شکوک و شبہات کا ازالہ ہے اس لئے اس میں عربیت و تفسیر کی دقیق علمی و فنی بحثوں سے تعرض کئے بغیر سلیس، عام فہم اور سلجھے ہوئے انداز میں مفہوم و مطلب کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور قرآن حکیم کے دعوتی و استدلالی پہلو کو بھی ایک حد تک نمایاں کیا گیا ہے۔ کئی نقشے اور تصویریں بھی دی ہیں جن سے قرآن مجید میں مذکور جگہوں اور مقامات کی نوعیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ صاحب تفسیر نے بہت سے ان مشرکانہ و غیر موحدانہ افکار و عقائد اور رسوم کی تردید کی ہے۔ جو اس وقت خود مسلمانوں کے بعض طبقوں میں رائج ہیں۔ سورۂ انفال کے بڑے حصہ میں غزوۂ بدر کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اور اس سے

پیدا شدہ امور و مسائل پر تبصرہ کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں ضعیف روایتوں اور مرجوح تفسیری اقوال نقل کرنے سے پرہیز کیا گیا ہے، اور آیتوں کی تاویل مناسب انداز میں کی گئی ہے۔ گو مصنف کے بعض نتائج تحقیق سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ان کی سعی و محنت سے اردو میں ایک اچھی اور مفید تفسیر مرتب ہو رہی ہے۔ اور یہ اس لحاظ سے بھی بہتر ہے کہ نہ تو زیادہ طویل ہے۔ اور نہ بہت مختصر، تاہم قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بڑی احتیاط اور ذمہ داری کا ہے۔ اس لیے ہم صاحب ترجمہ کی دو ایک بے احتیاطی کی نشاندہی کر کے ان سے گذارش کریں گے کہ وہ اسی انداز پر مزید غلطیوں کی بھی تصحیح فرمالیں۔

۱۔ كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ (انفال۔ ۵) ص ۵۸۶

(اور بدر کا واقعہ ٹھیک اسی طرح پیش آیا) جس طرح تمھارے رب نے تمھیں حق کے ساتھ تمھارے گھر سے نکالا تھا۔

قوسین کی عبارت بلا ضرورت اور زائد ہے۔ اور اس کے بعد ترجمہ کی عبارت سے شبہ ہوتا ہے، کہ مترجم کے نزدیک اس میں واقعہ ہجرت کی طرف اشارہ ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ قوسین کی عبارت حذف کر کے صرف اس قدر ترجمہ کافی تھا کہ "جس طرح تمھارے خدا نے تمھیں حق کے ساتھ تمھارے گھر سے (بدر کیلئے) نکالا۔

۲۔ لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ (توبہ۔ ۵۷) ص ۶۵۷

اگر وہ کوئی پناہ کی جگہ یا کوئی غار یا کوئی چھپنے کی جگہ پالیں تو بھاگ کر اس میں جا چھپیں۔

خط کشیدہ ترجمہ محل نظر ہے، مدخل کا ترجمہ چھپنے کے بجائے داخل ہونے یا گھسنے کی جگہ کرنا چاہیے تھا۔ اور لولوا الیہ وھم یجمحون کا ترجمہ اصل الفاظ کے مطابق نہیں۔

۳۔ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (انفال۔ ۱۰ ص ۵۹۰)

اور اللہ نے اس بات کو (تمھارے لئے) سرتا سر بشارت بنا دیا، اور یہ خوشخبری تمھیں اس لئے دی، تاکہ تمھارے دل مطمئن ہو جائیں ورنہ مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔

اتنے طویل ترجمے کے بجائے یہ مختصر ترجمہ کافی تھا۔ "خدا نے یہ صرف مسلمانوں کی خوشی اور اطمینان قلب کے لیے کیا اور فتح تو صرف خدا کے پاس ہے"۔ ایک جگہ غالباً سہو کتابت کی وجہ سے یہ چھپ گیا ہے کہ "وہ تعداد میں سو سے کچھ ہی زیادہ تھے"، (ص ۵۸۲) حالانکہ جنگ بدر میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ ۳۱۳ کے قریب تھی، ص ۶۳۸ پر ابو عبید کا سنہ وفات ۲۲۴ھ لکھا ہے، صحیح ۲۲۲ھ ہے۔

بھوپال تحریکات آزادی کے آئینہ میں :۔ مرتبہ جناب سید عابد علی وجدی الحسینی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۸۴ مجلد، قیمت ۶۰ روپے، پتہ بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ، بھوپال۔

اس کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں جنگ آزادی میں بھوپال کے حصے پر بحث و گفتگو کی گئی ہوگی۔ مگر اس کے مصنف مولانا سید عابد علی وجدی الحسینی قاضی شہر بھوپال کا علم و مطالعہ وسیع اور ذوق بڑا متنوع ہے، اس لئے انکا دائرہ بحث بھی وسیع ہو گیا ہے، اور انھوں نے متعلق و غیر متعلق ہر قسم کے مسائل چھیڑ دئے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کے شروع کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحے میں جن امور کا تذکرہ آگیا ہے۔ گو نہ اصل موضوع سے ان کی کوئی خاص مناسبت ہے، اور نہ انھیں مرتب انداز اور تصنیفی اہتمام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ تاہم اس حصہ میں

بہت سی مفید باتیں جمع ہوگئی ہیں، خصوصاً ولی اللّٰہی تحریک و دعوت اور اس کی حکمت و فلسفہ کے متعلق غیر مرتب طور پر ہی سہی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد بھوپال کی تاریخ ریاست کی تشکیل اور نوابوں کا ذکر ہے، پھر بھوپال کے بعض اہم اور ممتاز اشخاص کے حالات و کارنامے بیان کئے ہیں۔ اس میں کہیں کہیں ضمناً تحریک آزادی میں ان اشخاص کی خدمات کا بھی کچھ ذکر آگیا ہے۔ اسی سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی تحریکوں کے بارہ میں بھی منتشر باتیں تحریر کی ہیں۔ جن کا مقصد یہ دکھانا ہوگا کہ ان تحریکوں کا بھی اثر بھوپال پر رہا ہے۔ یا بھوپال نے ان میں حصہ لیا تھا۔ اس کے بعد بھوپال کے چند قاضیوں کا تذکرہ آگیا ہے۔ پھر بیسویں صدی میں آزادی سے پہلے اور اس کے بعد کی بعض قومی و سیاسی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ اس طرح اس کتاب میں اصل موضوع پر کم اور غیر متعلق بحثوں پر زیادہ لکھا گیا ہے۔ اور اس میں انتشار اور ژولیدہ بیانی بھی ہے۔ مصنف کے پاس مواد و معلومات کا بڑا ذخیرہ ہے، مگر وہ ان کو مناسب ترتیب اور اچھے انداز میں پیش نہیں کر سکے ہیں۔ ایک سنجیدہ علمی و تاریخی موضوع کے لئے ولولہ انگیز اور خطیبانہ پیرایہ بیان مناسب نہیں۔ ان باتوں سے قطع نظر کتاب معلومات کے لحاظ سے اچھی ہے۔

سفرنامہ حجاز، تردید حاضر و ناظر، العلم والعلماء، تحقیق مسنہ — از مولانا عبدالروف رحمانی جھنڈا نگری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات بالترتیب ۲۵۶، ۱۶۷، ۱۰۴، ۳۲ قیمت بالترتیب ۳، ۱۰، ۱، ۷۵ پیسے، ایک روپیہ ناشر شعبہ نشر و اشاعت جامعہ سراج العلوم السلفیہ جھنڈا نگر نیپال

جمعیۃ اہلحدیث کے مشہور صاحب علم مولانا عبدالروف صاحب رحمانی ناظم مدرسہ سراج العلوم جھنڈا نگر کی زندگی دین اور علم دین کی خدمت میں بسر ہوئی ہے۔ انھوں نے تحریر و تصنیف سے بھی ہمیشہ اشتغال رکھا۔ اور ان کی چھوٹی بڑی متعدد تصنیفات شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔

زیر نظر چاروں کتابیں بھی مولانا کی تصنیف ہیں، انھیں ۵۹ء میں پہلی دفعہ حج بیت اللہ کی سعادت میسر آئی تھی، پہلی کتاب اس کا سفرنامہ ہے۔ جو اس حیثیت سے عام سفرناموں سے مختلف ہے کہ یہ دراصل ان چھ مکاتیب کا مجموعہ ہے جو سرزمین حجاز سے مولانا نے اپنے چھوٹے بھائی کو لکھے تھے، ان خطوط میں سفر کی روداد اور اس کے مشاہدات و تاثرات کے علاوہ حج کے احکام و مناسک کے متعلق گوناگوں ضروری معلومات قلمبند کئے ہیں۔ خطوط کی صورت میں ہونے کی بنا پر اس سفرنامہ میں آمد و بے ساختگی ہے۔ اور یہ مطالعہ کے لائق ہے، دوسری کتاب بھی بہت پہلے چھپی تھی۔ اور اب اس کا دوسرا اڈیشن حذف و ترمیم کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ یہ ایک خاص طبقہ و مسلک کے ایک مولوی صاحب کے جواب میں لکھی گئی ہے اور اس میں کتاب و سنت کے علاوہ عقلی دلائل سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیب دانی اور آپؐ کے ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کے لغو عقیدہ کی تردید کی گئی ہے۔ گو رسالہ مناظرانہ انداز میں لکھا گیا ہے، تاہم اس سے مولانا کی وسعت علم و نظر اور جذبہ حق پسندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ تیسرے رسالہ میں علمائے سلف کے علمی شوق و انہماک اور کسب علم میں مشقت و ریاضت اور شاہان اسلام کی علم دوستی اور علما کی قدردانی کے موثر واقعات مستند کتابوں کے حوالوں سے درج کئے ہیں تاکہ لوگوں کو علم کی عظمت و اہمیت کا اندازہ ہو اور اس کے حصول کا شوق و جذبہ پیدا ہو، یہ رسالہ آج کل کے سہولت پسند علماء و طلبہ کے لئے خاص طور پر سبق آموز ہے، چوتھے رسالہ میں مولانا نے قربانی کے جانوروں کے بارہ میں حدیثیں جمع کرکے شروح و لغت کی کتابوں کی ان کی بقدر ضرورت شرح و توضیح کی ہے جس کا مقصد قربانی کے جانوروں کی عمر کے معاملہ میں عام لوگوں کی بے احتیاطی کو رفع کرکے یہ بتانا ہے۔ کہ ان کا مسنہ (دانتا) ہونا ضروری ہے۔

شادی کے سلسلہ میں جہیز نقد رقم کا مطالبہ :- از مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۴۰، قیمت دو روپیے پتے (۱) امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ، بہار (۲) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ لکھنؤ۔

اس زمانہ میں جہیز وغیرہ کے مطالبہ کی وجہ سے بچیوں کی شادی کا مسئلہ بہت پیچیدہ اور دشوار ہوتا جارہا ہے۔ اس پر دردمند اور ذمہ دار علماء اور مسلمانوں کی تشویش واضطراب بالکل بجا ہے۔ اس کتابچہ میں حدیثوں کے علاوہ فقہا اور مفتیوں کے اقوال سے یہ ثابت کیا گیا ہے۔ کہ ایسے مطالبہ کی بنیاد پر ملنے والی رقم شرعاً رشوت ہوگی جس کا لینا دینا۔ اور اس کے لیے واسطہ بننا سب حرام ہے، اور از روے حدیث ایسے سب لوگ ملعون ہوتے ہیں"۔ اسلام کے معاشرتی مسائل و عائلی قوانین کے مختلف پہلوؤں پر فاضل مصنف کی اچھی اور گہری نظر ہے۔ اس لئے انھوں نے اس مسئلہ پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ یہ کتابچہ اس لائق ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو۔ اور یہ ہر مسلمان کے مطالعہ میں بھی آئے۔

عکسِ آئینہ :- از جناب غوث محمد غوثی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۱۳۶ مع خوبصورت کور، قیمت ۲۵ روپے پتے (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، (۲) غوث محمد غوثی، سرائے رحمٰن، علی گڑھ۔

"عکسِ آئینہ" جناب غوث محمد غوثی کی غزلوں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ انھیں تغزل سے زیادہ مناسبت ہے۔ اور یہ مجموعہ متعدد اچھی اور کامیاب غزلوں پر مشتمل ہے اور اس سے مصنف کی فن پر قدرت اور اظہار بیان کے سلیقہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک پختہ مشق شاعر ہیں اور انھوں نے عصری میلانات کو قدیم شاعری کے باوقار انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ مندرجہ ذیل شعر سے ان کے اندازِ طبیعت اور رنگِ سخن کا اندازہ ہوگا ؎

جہاں اربابِ محفل خالی از دردِ جہاں ہوں گے
مرے نغمے وہاں ذوقِ سماعت پر گراں ہوں گے

جلد ۱۳۹، ماہ شوال المکرم ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۰ء عدد ۶

مضامین

مقالات